دھوپ کا سائبان

شعیب جاذب

شعیب جاذب کے ساتھ کافی عرصہ تک میری نشست و برخاست رہی ہے ان میں فروتنی، عجز و انکساری بدرجہ اتم ہے۔ ساغر صدیقی کی طرح درویش منش ہیں جن سے ہزاروں نے استفادہ کیا۔ دھوپ کا سائباں، ان کے جدید افکار، لاشعوری اظہار اور شعوری اشعار کا مرقع ہے

سید شفقت حسین، ایڈیٹر ماہنامہ پیاسِ گل۔ لاہور

شعیب جاذب علامتی شاعری کا معتبر نام۔ استعارات و کنایہ جات کی قلمرو کا حکمران، تلمیحات، تشبیہات میں اپج و جدت کا نام اور حلقہ دانشوراں میں قابل احترام۔

پروفیسر قیوم علی طاہر۔ نواب شاہ

شکیب جلالی مرحوم۔ الراقم نصرت چوہدری اور شعیب جاذب۔ ہم نے 1960ء میں روایت سے ہٹ کر نئے شعری پیکر تراشے، ان دنوں جناب جاذب ایک ہی نشست میں بیسیوں فی البدیہہ اشعار تخلیق کرتا۔ آج بھی وہ کئی شعری کتابوں کا مصنف ہے۔ دھوپ کا سائبان، ان کے جدید اشعار کا مرقع اور فنی پختگی کا ذخیرہ ہے

نصرت چوہدری استقلال کالونی سرگودھا

جناب شعیب جاذب لیہ میں عرصہ دراز سے ادبی محفلوں میں مرکزی حیثیت کے حامل رہے ہیں۔ میرا اُن سے قدیمی تعلق ہے اُن کی شاعری متنوع خیالات و افکار پر مشتمل ہے۔ صنائع لفظوی و معنوی سے مزین اور آراستہ ہے ان کا مجموعہ ،تفہیم الحسینؑ، اور، پیاسی چھاگل پیاسے لوگ، کی طرح، دھوپ کا سائباں، بھی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے

پروفیسر محمد رمضان زاہد، پرنسپل گورنمنٹ کالج کوٹ ادو

دھوپ کا سائبان
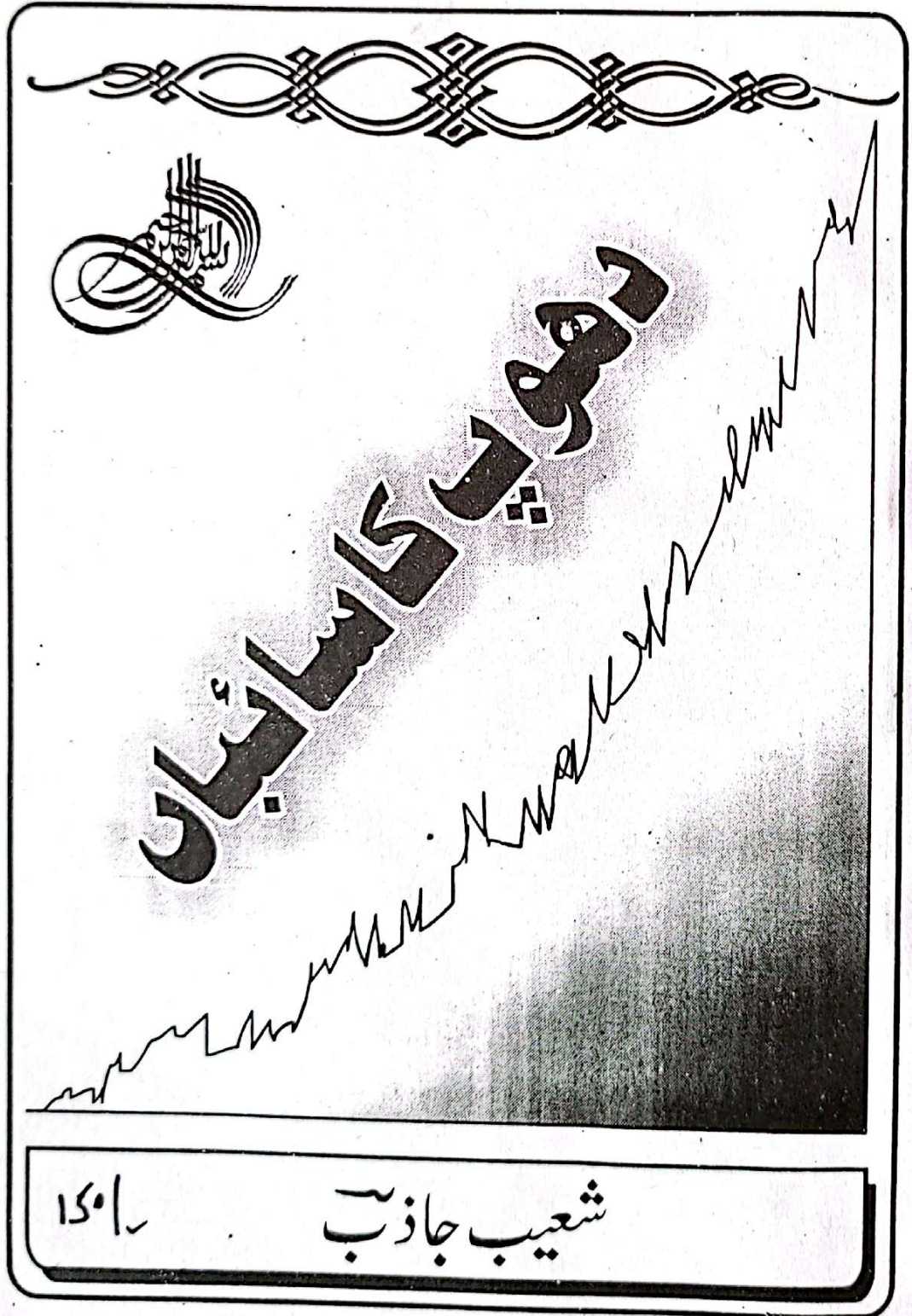
شعیب جاذب

۱۵۰/-

انتساب

صغریٰ بیگم کے نام

جو میری جانِ غزل ہے

اور میری سانسوں میں

نافۂ غزال کی طرح مہکتی ہے

شعیب جاذب

ضابطہ

نام کتاب-----------دھوپ کا سائباں

شاعر---------------شعیب جاذب

کمپوزنگ--------------یونس خان بزدار (عید گاہ روڈ لیہ)

تاریخِ اشاعت-----------مئی، 2006ء

سرورق----------- آرٹسٹ علی اعجاز نظامی، وحید بلڈنگ ملتان

معاونت-----------سید کوثر حسین بخاری۔ ایم۔ اے۔ ایم ایڈ۔

گولڈ میڈلسٹ، اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایجوکیشن لیہ

کتابستان

☆ ارشاد دانش ناز سینما روڈ لیہ

☆ کتاب مرکز بک لینڈ اُردو بازار بھکر

☆ گلف سٹیشنرز توپانوالہ بازار ڈیرہ اسماعیل خان

☆ ادارہ فکشن 18 مزنگ روڈ لاہور

☆ خزینہ علم وادب میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ لاہور

☆ المہدی کتاب گھر (امام بارہ گاہ) نواب شاہ

☆ ناصر کتاب گھر ٹریفک چوک ڈیرہ غازیخان

فہرست

محاکمہ

سید کوثر حسین بخاری ایم ۔ اے ۔ ایم ایڈ ۔ گولڈ میڈلسٹ 6-8

ڈاکٹر ظفر عالم ظفری پرنسپل گورنمنٹ کالج لیہ 9-14

پروفیسر مہر اختر وہاب گورنمنٹ کالج لیہ 15-20

پروفیسر محمد اکرم ناصر گورنمنٹ کالج پاکپتن 21-24

ڈاکٹر فرخ چیمہ لیہ 25-27

حضرت نسیم لیہ مصنف برگِ لرزاں 28-30

تاثراتِ زعمائے ادب۔

حکیم فقیر میاں الٰہی بخش سرائی 31

ڈاکٹر الطاف حسین قریشی لاہور، 31

رشید احمد رشی تونسہ شریف 31

پروفیسر قیوم علی طاہر 32

ملک ناصر عباس جوئیہ خوشاب 32

علامہ اقبال حسین جعفری احمد پور سیال 32

قرطاسِ تشکر ------------------ 33

درِ غزل

☆ جن کے سلامت پر ہوتے ہیں 35-36
☆ اس لیے پیڑ بڑے ہوتے ہیں 37-38
☆ اتر کے مجھ پہ یہ احسان کر گیا دریا 39-40
☆ جب دکھاتا ہے کوئی جوشِ جوانی دریا 41-43
☆ حرف ہی حرف ہیں گرداب روانی دریا 44-45
☆ بے کراں صحرا سمندر دھوپ ہے 46-47
☆ سر پھرے صحرا میں خودسر دھوپ ہے 48-49
☆ لاکھ پتھر کا گھروندا ہو کہاں رہ جائے گا 50-52
☆ روح سے رشتہ بدن کا جب جدا ہو جائے گا 53-54
☆ روح نے جسم کہاں چھوڑ دیا 55
☆ جہاں شکاری پرانی کمان چھوڑ گیا 56-57
☆ عقاب زخمی ہوا تو اُڑان چھوڑ گیا 58-59
☆ ڈھونڈ لاؤ کہ مسیحا ہیں کدھر شیشوں کے 60-61
☆ جس نے آنگن میں اگائے ہیں شجر شیشوں کے 62-63
☆ آندھی چلی ہے پھیلتا برگد اکھاڑنے 64-65
☆ قریہ قریہ ڈھلتی چھاؤں 66-68
☆ دھوپ میں لت پت گوری چھاؤں 69-73

☆	کبھی ہمراں جو چلتے ہیں پرائے سائے	74-75
☆	تیغ کو جو میان دیتے ہیں	76-77
☆	دھوپ سے جب بھی ٹھان لیتے ہیں	78-89
☆	دہشت میں کاروان کہیں بھی نہیں	80-81
☆	بادلوں کا نشاں کہیں بھی نہیں	82-83
☆	مہرونو کا نشاں ملے نہ ملے	84-85
☆	میرے سر پہ کہاں	86-87
☆	اک میرا آشیاں	88-89
☆	دشت میں کارواں تلاش کریں	90-91
☆	اس وقت خون گردشِ دوراں کا سرد تھا	92-93
☆	کب ہے امکان سفر کا ہو ارادہ کوئی	94-95
☆	کاغذ کے پھول عطر سے مہکا رہا ہوں میں	96-97
☆	ریاضِ فکر میں جانے لگا ہوں	98-100
☆	ہو نظر بندی جہاں زندان میں	101-102
☆	جانے کیا بیتی مرے اعصاب پر اوسان پر	103-104
☆	یوں بھی آنسو مری پلکوں سے لگا تار گرے	105-106
☆	مرا آنسو جھوٹی آشاؤں کی پیداوار ہے	107-108

☆	میں اپنی ذات میں برگد ہوں مرے سائے بہت	109-110
☆	ماں کے زخمی لال چپ رہنے لگے	111-112
☆	ایسے گھرا ہوا ہوں سلگتی دوپہر میں	113-114
☆	کرب زادوں کی صدا بولے ہے	115-116
☆	غموں سے اپنا ہم آغوش رہنا	117-119
☆	یہ مخمسہ بھی عجب ہے نہ سوزِ دل نہ سکوں	120-121
☆	دھوپ جو پیدل آتی ہے	122-124
☆	گل کے بدن سے جامۂ خوشبو اتار بھی	125-126
☆	دکھ جو کربل جیسا ہے	127-128
☆	پاؤں میں سانپ کچلنے والے	129-131
☆	سفر صحراؤں میں کٹتا رہا ہے	132-133
☆	چمن کا رازِ مہک جب صبا نے بھانپ لیا	134
☆	ملگجی تصویر تابندہ ہوئی	135
☆	اک دھوپ جو چھاؤں کی سہیلی بھی نہیں ہے	136
☆	پیڑوں نے کچھ سوچا ہوتا	137-138
☆	سرمئی دہلیز پر اک سرخ رہزن دیکھ کر	139-140
☆	وادئ عصر نے سورج نے یہ منظر دیکھا	141-142
☆	جگر لخت لخت	143-144

رم جھم کا شاعر

سید کوثر حسین بخاری ایم اے ایم ایڈ گولڈ میڈلسٹ

کاغذ کے پھول عطر سے مہکا رہا ہوں میں
دل تتلیوں کے جان کے بہلا رہا ہوں میں
مہنگی پڑی ہے جھولتی ٹہنی زبان کی
لفظوں کے پھول توڑ کے پچھتا رہا ہوں میں

یہ ''دھوپ کا سائباں'' کا خالق شعیب جاذب ہے۔ آج جس کا کلام عطر کی طرح قریہ قریہ مہک رہا ہے۔

''دھوپ کا سائباں'' بارشوں کی رم جھم میں ایک تازہ خوشبو کا جھونکا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ پیاسی چھاگل کا یہ شاعر صحرا سیراب کر دے گا۔

عجیب شخص ہے جو بارشوں کی رم جھم میں
سلگتی ریت پہ کچا مکان چھوڑ گیا

کلامِ جاذب میں موسیقیت کی لہریں یوں نکلتی ہیں۔ جیسے سانپ اپنی بانہوں سے بل کھاتے ہوئے نکلتے ہیں۔ دودھیا لہجے میں صحراؤں کا یہ سفر نت نئی منزلیں تلاش کرتا ہے۔

وہ اپنے دودھیا لہجے میں بات کرتا ہے
دمکتا چاند تو لہروں میں گنگنائے بہت

نقوشِ پا ، کہیں تو چھوڑ جاؤں
نئے صحراؤں میں جانے لگا ہوں

ریت ، دھوپ ، چھاؤں ، لہو ، خون ، آندھی ، برسات اور کرچیاں جیسے خوبصورت استعارات کا استعمال کر کے شاعر نے اپنے مجموعۂ کلام میں الفاظ کے ڈکشن کا انبار لگا دیا ہے۔

شعیب جاذبؔ کے ہاں آہ فریاد اور اشکِ رواں جیسی بڑی جاگیریں ہیں۔

آہ وفریاد و فغاں ، نوحہ کناں ، اشکِ رواں
قریۂ غم میں یہ کتنی بڑی جاگیریں ہیں

کلامِ جاذبؔ میں سلاست ، روانی اور تشنگی ایک منڈلاتی ہوئی بدلی کی طرح آتے ہیں۔ موسلا دھار بارش صحرا کو جل تھل کر دیتی ہے۔ پھر کڑکتی دھوپ کے بعد چھاؤں کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یہ "دھوپ کا سائباں ہے"۔

آج پیاسے پربت پر
ایک بدلی منڈلاتی ہے
کتنی نظروں میں بستی ہے
دھوپ نگر کی رانی چھاؤں
میں نے ابرِ کرم سے پوچھا
مجھ پر تیری کتنی چھاؤں

دھوپ ہے مہنگی بازاروں میں
گاؤں میں ہے سستی چھاؤں

تنہا اور اکیلی رات کا یہ شاعر اپنی منزل پر رواں دواں ہے۔ ضرور رات ڈھل جائے گی اور مسافر اپنی راہ پالے گا۔

خائف یہ دشمنِ جاں سے ہے اگرچہ
جاذبؔ کی طرح رات اکیلی بھی نہیں ہے

ناقدر شناس زمانے کی نظروں سے اوجھل یہ دریگانہ، درویش اور اُجلے مزاج کا حامل شاعر۔ کاش لوگ اسے سمجھ پاتے!

جاذبؔ تو درویش منش ہے
کاش تو اسکو سمجھا ہوتا

چاندنی شب میں دھوپ کا شاعر

پروفیسر ڈاکٹر ظفر عالم ظفری

لیہ پنجاب کا ایک دُور افتادہ علاقہ ہے۔ ریت کے بڑے بڑے ٹیلے اس کی خصوصی پہچان اور اسے ''تھل'' کا نام دیتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد لیہ کے بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور خواتین نے اس کی دھرتی کو یوں الٹ پلٹ کیا کہ کسانوں کے مدقوق زرد چہرے اقتصادی خوش حالی سے قدرے تمتمانے لگے ہیں۔ اگرچہ خوشحالی اپنے سنہری پر پھیلا رہی ہے۔ پھر بھی غربت و مفلسی نے لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ صنعتی ہنگامے معدوم ہیں۔ ایک تازہ ترین جائزے کے مطابق بااعتبارِ ترقی ضلع لیہ کا شمار چونتیسویں یعنی آخری ضلع میں ہوتا ہے۔ اسی طرح 2004 میں پنجاب کے تمام اضلاع کی ترقی کے لیے جتنی رقم رکھی گئی اس میں بھی ضلع لیہ آخری درجہ پر ہے۔

اقتصادی ناہمواری اور زرعی بنجر پن کے باوجود ضلع لیہ کے باسیوں کے اذہان نہایت زرخیز ہیں۔ بالخصوص شاعری کے میدان میں پیر و جوان فکرِ سخن میں مصروف رہے ہیں اور یہ مشقِ سخن نہایت روانی سے جاری و ساری ہے۔ مجھے متعدد مرتبہ مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے بڑی تعداد میں کہنہ سالوں، نوجوان اور جوانوں کو افکار تازہ کے موتی بکھیرتے اور جھولیاں بھر بھر کے داد وصول کرتے دیکھا ہے۔ بعض اوقات تو ایسے مشاعروں میں بھی جانا ہوا جہاں چالیس پچاس لوگ جمع ہیں ان میں نوجوانوں کی کثرت ہے۔ چہرے تو مضمحل ہیں۔ لیکن سب کے سب شاعر ایسے شعر کہتے ہیں کہ

حیرانی منہ تکنے لگتی ہے۔ لوگ زیادہ تر غزل پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لیکن گل وبلبل کے قصۂ عشق اور ہجر و وصال کے مضامین باندھنے کی بجائے انسانی محرومیوں اور اپنے علاقے کی صعوبتوں کا بیان کرتے ہیں۔ ارمان عثمانی، غافل کرنالی، نسیم لیہ، خیال امروہوی، شہباز نقوی اور شعیب جاذب کا نام بچہ بچہ جانتا ہے۔

شعیب جاذب کمال کا شاعر ہے غزل پڑھنے کا منفرد انداز سامعین کی روح میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اس کا لب ولہجہ اور الفاظ دونوں مل کر سامعین کو کیفیت سرور سے دوچار کر دیتے ہیں۔ ''دھوپ کا سائبان'' شعیب کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جاذب کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے، جس میں احساس کی شدت اپنے ہم عصر شعراء سے زیادہ ہے۔

عالمی سطح پر تلخیاں بڑھ رہی ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی، مذہب سے بیزاری اور بے راہ روی کو جنم دے رہی ہے۔ جنگلوں کی رات سے بچ کر آنے والے وادیٔ نوعِ بشر میں روندے جارہے ہیں۔ زوالِ آدمیت اور سائنسی ترقی دونوں کمال پر ہیں۔ ہوسِ زر، ہوسِ طاقت، ہوسِ حکمرانی اور تاج وتخت کے نشے نے اخلاقی قدروں کا جنازہ نکال دیا ہے۔ سچ سننے والے کان اور سچ بولنے والی زبانیں اپنا وجود کھو چکی ہیں۔

آہ و فریاد و فغاں کربِ جہاں اشک زوال
گریۂ غم میں یہ کتنی بڑی جاگیریں ہیں

جہاں جاگیریں ایسی ہوں وہاں غزل کا مفہوم ہی اور ہو جاتا ہے۔ ایسے میں غزل کا محبوب حسن محشر شکن، مشک ختن، گل بدن، رشکِ کبک، غنچہ دہن اور شمشاد

قد کیونکر ہوسکتا ہے۔ جاذبؔ کی غزل میں لبِ محبوب کی سرخی، رخسارِ حُسن کی لطافت اور ادائے محبوب کی دلفریبی کی بجائے، تپتے صحرا میں دھوپ کا سائباں ہے۔ یہی سب چیزیں جاذب کی غزل میں جذب ہو کر فکر انگیز ماحول کو تشکیل دیتی ہیں۔

جاذبؔ حُسنِ تخیل کے سہارے زندہ نہیں وہ اظہار کے لیے صنفِ غزل کا سہارا لیتا ہے لیکن چشم غزالاں میں آسودگی نہیں پاتا۔ وہ ایسے لاکھوں۔ کروڑوں انسانوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ جو کہلاتے تو انسان ہیں۔ لیکن حالاتِ جبر کے ہاتھوں حشرات الارض کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ ان انسانوں کی بات کرتا ہے جو ناہموار ی حالات، جبر مسلسل اور مفلسی کی قبا کو سیتے سیتے کفن اوڑھ لیتے ہیں۔ وہ اس طبقے کی بات کرتا ہے۔ جو نانِ جویں کے دو لقموں کی خاطر قاقم و سمور پہننے والوں کے جوتے سیدھے کرتے کرتے عمر بتا دیتے ہیں۔ لیکن دنیا کی کوئی سہولت ان کے دروازے کی دستک نہیں بنتی، وہ کہتے ہیں ۔

نہ پہنچے ہم کبھی بام فلک تک
اگر چہ سیڑھیاں چڑھتے رہے ہیں

جاذبؔ کی غزلوں میں مسرت و تبسم، دلفریبی کا احساس، زندہ رہنے کی تمنا کچھ سنہرے لمحات، زیست ٹھہر جانے کی خواہش، جگنوؤں کو پانے کی چاہت اور خوشبوؤں کے ساتھ سفر کرنے کی آرزو نہیں۔ بدحالی انسان نے اسے مکمل طور پر یوں اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے کہ وہ زندہ رہنے کی دعا سے بھی ڈرتا ہے ۔

قریۂ کرب میں رہتے رہتے
زندہ رہنے کی دعا سے ڈرتا

کرب کی پتیاں چنتے چنتے
سرخ پھولوں کی قبا سے ڈرتا

جاذب کا اپنا تعلق بھی دکھوں کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پستے ہوئے انسانوں سے ہے۔ وہ تو سلگتی دوپہر میں اور شعلوں کے قہر میں زندہ ہے۔

ایسے گھرا ہوا ہوں سلگتی دوپہر ہیں
جیسے شجر ہو دشت کا شعلوں کے قہر میں

جاذب کی غزل زندگی کا زہر چاٹنے والوں کی زبان ہے۔ دکھوں، صعوبتوں، مایوسیوں، آنسوؤں، حسرتوں اور ذلتوں کے مارے لوگوں کی بات کرتے ہوئے وہ ایسے اشعار بھی کہہ دیتا ہے۔ جو بہت سے غزل گو شعراء کے ہزاروں اشعار سے زیادہ وزنی ہوتے ہیں۔ انسانی دکھوں کے اظہار کے لیے ان کے یہ اشعار پڑھنے والے کی فکر کے لیے تازیانے کا کام کرتے ہیں۔

ایک لمحے کا سکوں جاذب نہیں
گھر کے اندر حبس باہر دھوپ ہے
یوں لگا ہے شدتِ احساس میں
چاندنی شب میں سراسر دھوپ ہے

کتنی بڑی بات کتنے خوبصورت اسلوب میں کس سادگی اور بے تکلفی سے کہی گئی ہے۔ ایسی بات ایسے انداز میں وہی کہہ سکتا ہے جس کا دل درد سے لبریز ہو۔

جاذب نے دھوپ، کرب، کرچیاں، شجر، چھاؤں اور سائبان کا استعارہ بہت کثرت سے استعمال کیا ہے۔ یہ سب علامات اور استعارے دکھی انسانیت کی ترجمانی

کرتے ہیں۔ جاذب کسی لمحے بھی اپنے معاشرے سے نظریں ہٹا کر گل خنداں کا رفیق نہیں بنتا۔ وہ ظلم، جبر، ناانصافی اور ناہمواری۔کے ایسے گرداب میں پھنسا ہے کہ تبسم اس کا مقدر بنتا ہی نہیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ انصاف کے گلے پر چھری کون پھیر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ظالم کا تو کیا رونا وہ تو ظلم کا عادی ہے۔ ماتم تو اس بات کا ہے کہ کرسیِ عدالت پر بیٹھا انسان انصاف کا گلا کاٹ رہا ہے۔

یہ کتنا ظلم ہے منصف کے ہاتھوں
گلا انصاف کا کٹتا رہا ہے

کسی بھی معاشرے کی تباہی و بربادی دراصل انصاف کا خون ہونے سے وابستہ ہے۔ جاذب ایسے معاشرے کا فرد ہے جہاں عدل کرنے والا خود عدل کا خون کر رہا ہے۔ جاذب نے گہرے مشاہدے اور فکر کے ساتھ اس معاشرے کو دیکھا ہے جس میں وہ زندہ ہے۔ وہ اس معاشرے کا فرد ہے جہاں لسانی، نسلی، علاقائی، صوبائی اور مذہبی تعصّبات آکاس بیل کی طرح پھیل رہے ہیں۔ نفرتیں برگد کے درخت کی طرح پھیل رہی ہیں۔ ساٹھ سال گزرنے کے باوجود پاکستانی ایک قوم نہیں بن سکے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ ان تعصّبات کے خاتمے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ جاذب اس صورتِ حال سے نہ صرف خود پریشان ہے بلکہ لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑتا بھی ہے۔

ہر طرف آگ تعصب کی جلی
اب بھی ہے شہر ہیں جلنے والے

ہم خاک و خون کے سمندر سے تو نکلے لیکن تعصبات کے سمندر سے نہ نکل سکے۔ ساحل پر پہنچ کر بھی تشنہ لب ہی رہے۔ جاذب نے اپنے اظہار کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ نہایت جاندار ہے۔ اس کے لب و لہجہ میں وہی کڑک اور وہی شور ہے جو بے قصور انسان کے دار کی طرف جاتے ہوئے ہوتا ہے۔ فکر کے ساتھ اس کے فن میں وہ پختگی ہے جو اسے اساتذہ ٔ لیہ میں شامل کرتی ہے۔

جاذب کا یہ خیال ہے کہ ایک وقت آئے گا جب وہ ہر کہانی کا عنوان ہو گا اور ہر داستان کی زینت بنے گا۔ اسے اپنے لہجے اور طرزِ بیاں پر بھی بڑا فخر ہے۔

ہر کہانی کا بنایا جائے گا عنواں مجھے
ایک میرا نام زیبِ داستاں رہ جائے گا
اور اسلوبِ غزل جاذب فنا ہو جائیں گے
اک مرا لہجہ مرا طرزِ بیاں رہ جائے گا

یہ تو میں نہیں کہتا کہ دیگر اسالیبِ غزل جاذبؔ کے اسلوب کے سامنے مدہم پڑ جائیں گے لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ جاذب کا اسلوب اور لہجہ تاریخِ اُردو غزل میں تا دیر سلامت رہے گا۔

عصری حسیّت کا شاعر

پروفیسر مہر اختر وہاب صدرِ شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج لیہ

شعیب جاذبؔ کا دوسرا شعری ''دھوپ کا سائباں'' کلاسیکی فنی روایات اور عصری طرزِ احساس کے ساتھ جلوہ آرا ہے۔ اگر چہ انہوں نے غزل اور نظم دونوں میں اپنی طبع رسا کا ثبوت دیا ہے۔ تاہم ان کی غزل فن اور فکر کے اعتبار سے استادانہ شان رکھتی ہے۔ خوشنما تراکیب، لطیف کیفیات اور انتخابِ الفاظ نے انہیں جدید غزل گو شعرا کی صف میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ دھوپ اور چھاؤں ان کے ہاں عصری صداقتوں کے استعارے ہیں۔

گاؤں والے سوچ رہے ہیں
کون خریدے مہنگی چھاؤں

جھلستی دھوپ کے صحرا میں ایسا پیڑ ہوں میں
خود اپنی چھاؤں کی حدت جسے جلائے بہت

وہ برگد کی طرح رہنے لگا ہے
ستم ہر دھوپ کا سہنے لگا ہے

شعیب جاذبؔ نے اس وقت اپنے شعری سفر کا آغاز کیا جب لیہ کے شعری افق پر نسیم لیہ، راجہ عبداللہ نیاز، سنبل قریشی، ارمان عثمانی، غافل کرنالی، نذیر

چوہدری، ڈاکٹر قیصر عباس رضوی، غلام جیلانی فرمان (پٹیالوی) اورعبد الحمید ذکی چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے فنی مشق ومہارست اور ذوقِ جنوں کی بدولت بہت جلد شعر میں اپنی الگ شناخت پیدا کر لی۔ ان کی غزل بلند خیالی اور اعلیٰ انسانی اقدار و جذبات کی ترجمان ہے۔

گو ہم ہیں آوارہ سورج
شام کو پھر بھی گھر ہوتے ہیں

شعیب جاذب بہت ہی نڈر اور بیباک شاعر ہے۔ انہوں نے جراتِ اظہار سے اپنے لفظوں کو زندگی کے حقائق کا آئینہ خانہ بنا دیا ہے۔ ان کی غزل عصرِ رواں کے انتشار و اضطراب اور احساسِ محرومی وتنہائی کی عکاس ہے۔ معاشی مسائل اور معاشرتی شکست وریخت ان کی غزل کا مزاج ترتیب دیتے ہیں۔ انہوں نے معاصر زندگی کی کربناک کیفیات کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ وہ خوابوں کی دنیا آباد نہیں کرتے بلکہ سماجی وطبقاتی تضادات کو جرات سے بے نقاب کرتے ہیں۔

تم کو عہدِ جبر میں بھی کھولنا ہوگی زباں
ورنہ اس دنیا میں تو ہی بے زباں رہ جائے گا

جانے کیا بات تھی احباب تھے سب سنگ بدست
وادیٔ زخم سے اک روز جو مڑ کر دیکھا

بیچ ڈالے شجر کسانوں نے
چھاؤں کا اب نشاں کہیں بھی نہیں

آندھی وہی چراغ بجھانے پہ ہے بضد
دیتا ہے روشنی جو سرِ راہ گزار بھی

شعیب جاذب تجربے کی نوعیت اور جذبہ واحساس کی مناسبت سے الفاظ وتراکیب کا انتخاب کرنے پر قادر ہیں۔ ان کے ہاں لفظ ومعنی کا توازن اور ہم آہنگی نمایاں ہے۔ لفظ اور مضمون کا رشتہ ان کے ہاں جسم وجاں کا رشتہ بن جاتا ہے۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ اور اسلوبِ اظہار کی بوقلمونی اور رنگا رنگی سے انکار ممکن نہیں۔ انہوں نے زبان کی روانی، عمدہ تراکیب، قدرتِ الفاظ اور تشبیہہ واستعارے کی ندرت سے ایک دلکش اسلوب تخلیق کیا ہے۔

رہگزاروں میں جو بکھری ہوئی تصویریں ہیں
دھوپ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں ہیں

چاندنی رات، سحر، رقصِ شجر، نورِ گہر
کسی عکاس کی منہ بولتی تصویریں ہیں

میں اپنی ذات میں برگد ہوں میرے سائے بہت
خود اپنی پھیلتی شاخوں سے خوف آئے بہت

میں ہوں سرمست فاقہ مستیوں میں
ترانے بھوک کے گانے لگا ہوں

جلانے جا رہا ہوں اپنی کشتی
میں پھر تاریخ دہرانے لگا ہوں

شعیب جاذبؔ کی غزل میں اظہار کی تہہ داری فکری حوالے سے آئی۔ اس طرح انہوں نے آج کے انسان کا بنیادی مسئلہ نفسیاتی پیچیدگی کو قرار دیا ہے۔ کلاسیکی غزل میں اجتماعی تجربات واقدار کا اظہار ملتا ہے مگر شعیب جاذبؔ کے ہاں اجتماعی فکر کے ساتھ انفرادی تجربے، احساس اور نفسیات کی ترجمانی نے غزل کا روپ اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مضامین کا تنوع بھی ہے اور بیان کی تازگی بھی۔ وہ غزل کی روایتی ورسمی فضا اور پرانے طرزِ اظہار کے بجائے فطری اور انفرادی احساسات وروایات کو وسیلۂ اظہار بناتے ہیں۔

گفتگو میں ہے مہک پھولوں کی
کس سلیقے سے صبا بولے ہے

یہ کس نے تیر پھینکا آسماں پر
خلاؤں سے لہو بہنے لگا ہے

جانے کیوں سہمے ہوئے ہیں لوگ سب
گونجتے پنڈال چپ رہنے لگے
جبر کے چابک کی اک آواز سے
دھاڑتے چوپال چپ رہنے لگے
مضطرب گاؤں کے گاؤں دیکھ کر
شہر کے خوش حال چپ رہنے لگے

شعیب جاذب کی غزل نئے انسان کے مسائل کا اظہار بھی ہے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ آگہی کی ترجمان بھی۔ اس طرح ان کی غزل عصری حسیت کی ترجمان بن کر نمودار ہوئی ہے۔ انہوں نے غزل کی روایات، لفظیات اور استعارات کو ہم عصر تمدنی مسائل کی پیش کش کا وسیلہ بنا دیا ہے۔

تیرگی چھا گئی فصیلوں پر
کوئی روشن مکاں تلاش کریں
حادثوں میں گھرے ہیں مدت سے
کوئی سکھ کا جہاں تلاش کریں

بھوک بڑھتی ہے ساہوکاروں کی
جب بھی گندم کسان دیتے ہیں

حادثوں کے نصاب کیا کہنا
آج تک امتحان دیتے ہیں

آج کہیں انسان نہیں
شہر بھی جنگل جیسا ہے

لاکھوں جتن کیے کوئی انساں نہ مل سکا
انسانیت بھٹکتی رہی شہر شہر میں

دھوپ کا سائباں

محمد اکرم ناصر استاد شعبہ اردو گورنمنٹ کالج پاکپتن

میں نے آج تک شعیب جاذبؔ کو نہیں دیکھا جیسے میر، غالب اقبالؔ، شکیب جلالی اور بہت سے شاعر لیکن ان کی شناخت ان کے متعلق تبصرے پڑھے ہیں آج پاکستان کے معیاری رسائل میں ان کا کلام اور ان پر اوراق گردانی سے ان کا ادبی مقام متعین ہے۔ شعیب جاذبؔ واقعی عظیم شاعر ہیں۔

برادرم اسلم کولسری نے مجھے بتایا کہ شعیب جاذبؔ کا تعلق لاہور سے نہیں لیہ سے ہے۔ لیہ کے نام سے ہی ریت کے ٹیلوں کا تصور ذہن میں آتا ہے اور ساتھ ہی موصوف کا یہ شعرؔ

سنا ہے لمبی زبانیں نکال کر ٹیلے
یہ کہہ رہے تھے کہاں جا کے مر گیا دریا

ماحول کا اثر انسانی زندگی ان کے رہن سہن، چال ڈھال اور اس کے فن پر ہوتا ہے۔ شعیب جاذبؔ کی شاعری پر بھی اس ماحول کا اثر غالب ہے۔ اس نے بگولوں کا رقص بگولوں میں گھر کر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

بل پہ بل کھانے لگی ہے ہر بگولے کی کمر
یہ انوکھا رقص صحراؤں کی پیداوار ہے

فطری مناظر کا یہ عکاس اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے مناظر کو اپنے تک

محدود نہیں رکھتا بلکہ اپنے قاری کو بھی اس تجربے میں شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
اسی لیے وہ اپنے ہر خیال پر سوچ اور آنکھوں دیکھے ہر منظر کو شعری روپ دیتا ہے۔
اسے گاؤں کی گوری اور صبح کا سورج ایک جیسے نظر آتے ہیں۔

خال وخد اس کے ترے چہرے سے ملتے ہیں بہت
صبح کا سورج تیرے گاؤں کی پیداوار ہے

گاؤں کی خوبصورتی کا تذکرہ وہی شخص کرسکتا ہے جو خود گاؤں میں رہا ہو۔ گاؤں کی زندگی فطرت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا سبزۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

یہ سبزۂ صحرائی فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اپنی شاعری میں اونٹ، ریت، ٹیلوں، صحراؤں، دریاؤں، جھیلوں، پگڈنڈیوں، بارشوں اور قوسِ قزح کا تذکرہ کرنے والا شاعر شعیب جاذبؔ صرف لفظوں کی بازی گری نہیں کرتا بلکہ ان نمائندوں کو ایک نئی معنویت دیتا ہے۔

کتنے کھلتے ہیں تباہی کے دہانے جاذبؔ
جب بھی کرتا ہے کہیں نقلِ مکانی دریا

میر تقی میر کا ایک مشہور شعر ہے۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات

کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

آج سے پہلے میں دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کرتے وقت ہمیشہ اسی شعر کا حوالہ دیا کرتا تھا یا کبھی اس شعر کے ساتھ وہ شعر بھی یاد آجاتا تھا کہ

آوارگان عشق کا پوچھا کبھی نشاں

مشتِ غبار کہہ کے صبا نے اڑا دیا

لیکن اب دھوپ کے سائباں کے خالق نے اس سلسلہ میں کمال کا شعر دیا ہے یہ شعر آج کے دور کا شعر ہے۔

میں نے پوچھا کہ ثباتِ ہستی

اس نے سگرٹ کا دھواں چھوڑ دیا

یہ شعر معنویت کے لحاظ سے اپنے اندر کتنی آفاقی سچائی رکھتا ہے۔ دنیا سگرٹ کا دھواں ہی تو ہے جو منہ سے نکلتا ہے اور ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اسی غزل کا مطلع جہاں سہلِ ممتنع کی ڈیل میں آنے والا بہت خوبصورت شعر ہے وہاں معنوی لحاظ سے جسم و روح اور اس کائنات کے صحیح تعلق کو واضح کر رہا ہے۔ جسم کا روح سے یا روح کا جسم سے جو تعلق ہے اس شعر سے بڑھ کر اس کا اظہار اور کیا ہوگا۔

روح نے جسم کہاں چھوڑ دیا

اک کرائے کا مکاں چھوڑ دیا

شعیب جاذبؔ کی شاعری کا کینوس محدود نہیں روح کو اک کرایہ دار تصور کرتا ہے۔

سورج اس کی نظر میں ایک تپنگ ہے جو کرنوں کے ڈور کے سہارے اڑ رہی ہے۔

ڈور کرونوں کی جو کاٹوں تو یہ سورج کی پتنگ
گرتی پڑتی مرے پاؤں میں کئی بار گرے

بچوں کی طرح سورج کا پتنگ سے کھیلنے والا شاعر حساس ذہن رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ دنیا کیا ہے دنیا کی حقیقت کیا ہے۔ دنیا فریبی ہے مگر پھر بھی وہ فریب کھاتا ہے۔

دانستہ کھا رہا ہوں چمکتا ہوا فریب
جگنو بجھے چراغ پہ چپکا رہا ہوں میں

عام تاثر یہ ہے کہ بڑا شاعر ہی بڑا شعر یا بڑا فنکار ہی بڑی تخلیق دے سکتا ہے یہ تاثر بجا بھی لیکن شعیب جاذبؔ کی شاعری سے ترشح ہے کہ وہ بھی بڑے شاعروں کی صف میں ہے۔ دھوپ کا سائبان میرے دعوے کی دلیل ہے ایک اور شعر۔

روح کیسے عمر بھر کی قید سے آزاد ہو
اب بھی سانسوں کی سلاخیں ہیں درِ زنداں پر

جدید رویوں کا شاعر

ڈاکٹر فرخ چیمہ۔

جدید رویوں کا پیکر شعیب جاذب کلک وقلم کی قلمرو کا خود مختار حساس شاعر ہے۔

سہ ماہی فنون سہ ماہی اوراق، سہ ماہی قلم قبیلہ، سہ ماہی سیپ، سہ ماہی گل بکف جیسے معیاری ما ہناموں اور مئوقر جرائد میں ان کے کلام کا شہرہ ہے۔

''پیاسی چھاگل پیاسے لوگ'' کی غزلیات اور زیرِ نظر مسودہ ''دھوپ کا سائباں'' کی غزلیہ سے واضح ہے کہ موصوف جدید رویوں کا شاعر ہے۔غزل صرف صنفِ نازک سے گفتگو کرنے کا نام نہیں بلکہ اس کے دامن میں متنوع موضوعات موتیوں کی طرح دمکتے نظر آتے ہیں۔

بے باکی اور اک ان کے اظہار کا ایسا پیرہن ہے جو کبھی تار تار نہیں ہوتا۔

وہ پراں طائر سر باز کی طرف اشارا کرتا ہے۔

جن کے سلامت پر ہوتے ہیں
خون میں اکثر تر ہوتے ہیں
گل کے ہاتھ سے اُڑ جاتی ہے
خوشبو کے بھی پر ہوتے ہیں

اونچے اونچے محلوں کو پہروں پرکھنے والا گرمئی اضطراب مثل سیماب پاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کو ٹٹولتا ہے تو ان کے اذہان و خرد آلائشوں کی حدت و

شدت میں لت پت نظر آتے ہیں ۔ چھاؤں کا متلاشی جونہی قدم بڑھاتا ہے تو جہت درجہت صحرائے بےکراں اور اُس کے مسافرِ لُو زدگاں سروں پر سلگتا جھلستا مہر تپاں ۔

میرے سر پہ کہاں
دھوپ کا سائباں

جب شعیب جاذبؔ نوجواں نسل کو غربت کے چیتھڑوں میں دیکھتا ہے تو ان معاش زدوں کو مبنی بر حقائق ناصحانہ مشورہ دیتا ہے ۔

اس لیے پیڑ بڑے ہوتے ہیں
اپنے پاؤں پہ کھڑے ہوتے ہیں

شعیب جاذبؔ جدید لب و لہجے کے شاعر ہیں ۔ فکری اپچ ان کا شعار ان کے اشعار میں ندرت افکار ہے ۔ وہ ہمیشہ اپنی غزل کی روایت سے ہٹ کر نئی ردیفیں تلاشتا ہے

1- ڈھونڈ لاؤ کہ مسیحا ہیں کدھر شیشوں کے
2- یہ مخمسہ بھی عجب ہے نہ سوزِ دل نہ سکوں
3- دھوپ میں لت پت جلتی چھاؤں
4- دھوپ کا سائباں ملے نہ ملے
5- جنگل جنگل مست ہوائیں

موصوف کا رسیلا، سجیلا، پیرایۂ اظہار نابغۂ روزگار قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ان کے ہاں متنوع تلمیحات، تجرباب ومشاہدات، ماورائی تناظرات، مافوق الفطرت حوادثات صوری ومعنوی رجحانات ومیلانات ان کی متنوع شاعری کا آراستہ وپیراستہ حریری پیرہن ہیں ایسا زود گو شاعر جوایک ہی نشست میں بیسیوں اشعار موزوں کرتا ہے۔سخن وری کے کوہِ بیستوں سے جوئے شیر لانا،سنگلاخ منازل طے کرنا ان کی جبلت یا میدان طبع کا رچاؤ پن ہے۔ سچ پوچھئے تو شیعب جاذبؔ بڑی صلاحیتوں کا شاعر ہے۔

وہی معروف ہوئے ہیں جاذبؔ
جن ادیبوں کے دھڑے ہوتے ہیں

نئے موسموں کا شاعر

حفظ تسنیم لیہ ۔ مصنف برگِ لرزاں

شعیب جاذبؔ نے ہر دور میں اپنے مختلف ناموں کی طرح فن میں بھی مختلف مدارج طے کیے ۔فنی مدارج کی یہ تبدیلیاں عمر کے ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہیں اور ہونی بھی چاہیں دراصل یہ تبدیلیاں ارتقاء کی دلیل ہیں جس سیڑھی پر آج ہم شعیب جاذبؔ کو ایڑھیاں اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہے ہیں یہ کسی بلند بام منزل کے سفر کا وہ لطیف اشارہ ہے جو اس کے روشن مستقبل کی واضح نشاندہی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ شعیب جاذبؔ نے لیہ جیسے لق ودق ''وسیب'' میں آنکھ کھولی جہاں تھل کی بے شمار نہروں کے باوجود فن کی آبیاری کے لیے ایک قطرہ بھی میسر نہیں؟ اس بانجھ و بے آب وگیاہ بستی میں جہاں کوسوں علمی وادبی ہریالی کا نام نشاں تک نظر نہیں آتا وہاں پروفیسر جعفر بلوچ اور شعیب جاذبؔ نے اپنے آنسوؤں کی رم جھم میں دل کے زخموں کو ہرا ہی نہیں رکھا بلکہ ساون برکھارت جیسا سماں پیدا کر کے ایک ایسے چمن رنگِ دبستان کی بنیاد ڈالی ۔جس کی خوشبو آج دور دراز علاقوں کو بھی مہکا رہی ہے کہ اس نے کم عرصے میں اپنی ندرتِ تخلیق سے اپنی پہچان کرائی اور دور دور تک اپنی فنی نگہتیں لٹا کر دبستانِ لیہ کو رنگ ونور کرنے میں خوشگوار اضافہ کیا۔

آج میرے کلاس فیلو گوپی چند نارنگ اگر دہی سے واپس اپنے لیہ میں آتے تو انہیں یہ دیکھ حیرت ہوتی کہ آج وہی ریگزار اپنے باغ و بہار موسموں اور

اپنے عطر بیز گلابوں سے کس قدر مہک رہا ہے۔ ریت کے انؔ ٹیلوں کو گلزار بنانے والے شعراء نے اس ریت اور دھول سے اٹی ہوئی بستی کو اپنی تخلیقات سے ایسا لالہ زار علم وادب بنادیا کہ ادبی دنیا میں لیہ ادب کی شناخت بن کر رہ گیا ہے۔ تھل کو جل تھل کرنے والے لیہ کے اس دانش ور نے اپنے قلم کے لہو پسینے سے گلنار یں خوشبوئیں اُڑائیں ہیں نوائے وقت کے قاری شاہد ہیں کہ شعیب جاذبؔ عصرِ حاضر کی تخلیق غزل میں ایک زندہ و پائندہ اور نمائندہ نام نظر آتا ہے جسے دور افتادہ ہونے کے باوصف فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کو مضافاتی شاعر کہ کر اس کی عظمتِ فن کا اعتراف نہ کرنا کتنے دکھ کی بات ہے۔ لاہور کے بزرگ چہروں کے اس لیے ناپسندیدہ ہیں کہ وہ لاہور کی چکا چوند فضاؤں میں رہتے ہوئے فکری تجلیوں اور روشن براق ندرتوں سے ابھی تک محروم ہیں۔ اسی محرومی کا نتیجہ ان کی دلی نفرتوں کا اظہار ہے کہ وہ دور افتادہ اور دور دراز علاقوں کے مشاہیر نابغہ ذہنوں کو بھی قصباتی نام سے موسوم کر کے خود کو طفل تسلیاں دیتے رہتے ہیں حالانکہ ادب قصباتی ہوا کرتا ہے اور نہ ہی کسی کی میراث۔ اس لیے میں ببانگِ دہل یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ لیہ جیسی ادبی جھوک سے شعیب جاذبؔ کا نام عدالت کے فیصلوں کی طرح دوٹوک ہے؟ دھوپ کا سائباں میں شاعر نے اپنی دلگداز اور جانکاہ صعوبتوں یا تھکا دینے والے سفر کے ان نا ختم اور تلخ تجربوں کو شعر میں اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے جو اُسے منزل تک پہنچتے پہنچتے قدم قدم پر پیش آئے؟ غرضیکہ کہ آج کی نئی غزل میں

شعیب جاذؔب کی نئی آواز اُس کے قلم کی قوت تسخیر کا منہ بولتا اور گرجتا گونجتا ثبوت ہے۔ ذرائع ابلاغ کو دہلا دینے والی یہ صدا اور یہ گھن گرج جاذب کی فتوحات کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے میں آخر پر متوقع ہوں کہ عصرِ موجود کے تخلیق نگار یا نقاد شعیب جاذؔب کی غزل کو پرکھنے کے بعد میری رائے سے اختلاف یا اعتراف کرتے ہوئے دامنِ انصاف ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے۔

23 جنوری 1989ء   بشکریہ نوائے وقت ملتان

تاثراتِ زعمائے ادب

ادب کی کئی جہتیں ہیں ۔معروف جہات میں غزل ،نظم ،سہ حرفی ،رباعی ،
مخمس ،دوہا ،ماہیا ،ہائیکو ،تضمین ،محاسن شعری میں سہلِ ممتنع ،تکرار لفظی ،صنعت ضد
ین ،مرعات النظیر وغیرہ ۔اسی طرح عزائی ادب میں بھی قصائد ،مناقب ،سلام ،
مرثیہ گوئی علاوہ ازیں سرائیکی ادب میں عزائیہ ،حسینی دوہڑے ،وہر ،نوحہ ،قطعے غرض
شاعری کی تمام تر اصناف میں دادو تحسین سمیٹنے والا شاعر شعیب جاذب ہے ۔''دھوپ کا
سائباں'' محاسن شعری سے لبریز ۔استعارات ،تشبیہات ،کنایہ جات اور تلمیحات
ادب میں مروج ہر علامت سے مکلّف ہے مختصر یہ کہ شعیب جاذب کی شاعری ہر دل
عزیز اور علامتی ادب کی شاہکار ہے ۔

حکیم فقیر میاں الٰہی بخش سرائی
محققِ ومورخِ لیہ

شعیب جاذب کا ناقۂ افکار و اظہار ادب کی تمام شاہراہوں پر سرپٹ
دوڑتا ہے ۔اُن کے دودھیا افکار کا ماہ تمام جس کی اپنی دمکتی مہکتی کرنیں اور اپنی
چکا چوند ہے ۔''دھوپ کا سائباں'' میں ان کا لہجہ اور اسلوب الگ اور منفرد ہے ۔
شعیب جاذب علامتی شاعری کا معتبر نام ،استعارات وکنایہ جات کی قلمرو کا حکمران
تلمیحات وتشبیہات میں اپج وجدت کا نام اور حلقۂ دانشوروں میں قابلِ احترام ۔
رشید رشی ۔تونسہ شریف

جداگانہ لب ولہجہ کا شاعر شعیب جاذبؔ متنوع موضوعات ادب کا پرچارک اور علامتی ادب کا سرمایہ ہے۔ گوناگوں ردیفوں اور بوقلموں قافیوں میں عمدہ افکار اور تازہ استعارے تخلیق کرنا ان کا وطیرہ ہے۔

ملک ناصر عباس جوئیہ۔ خوشاب

ادب ایک ایسے مہکتے دمکتے تابندہ و درخشندہ صراط کا نام ہے جس پر چلنے والے ہزاروں لیکن ان میں ممیّز چند مسافر ہیں، جن میں صاحبِ اسلوب شعیب جاذبؔ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ وہ 1960ء سے مسلسل اپنے شعری سفر پر رواں دواں ہیں۔

علامہ اقبال حسین جعفری۔ احمد پور سیال

اکثر اوقات شاعری واقعات کی بے رخی اور حالات کی بے رحمی وستم ظریفی کا ردِعمل ہوتی ہے۔ شعیب جاذبؔ کی شاعری بھی انہیں بنیادوں پر استوار ہے جو فکری گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر خارجی حصار میں احساس بن کر ابھرتی ہے۔ اسی احساس کے آئینے کے حوالے سے اسے گوناگوں دنیا کی پہچان ہے اور اسے اپنی ذات کا عرفان بھی ہے۔ وہ حساسیت کے یخ بستہ خنک تر سائے میں سلگ سلگ کر ''دھوپ کا سائباں'' تلاش کرتا ہے۔ خدا کرے ان کی یہ آرزو بر آئے۔

عبداللہ یزدانی۔ ڈیرہ اسماعیل خان

اظہارِ تشکر

میں محترم سید کوثر حسین شاہ بخاری (اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایجوکیشن لیہ) کا بہت ہی ممنون ہوں جن کی خصوصی معاونت سے میری تخلیقی کتب اشاعت پذیر ہوئی ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، پروفیسر مہر اختر وہاب، پروفیسر محمد اکرم ناصر اور دیگر زعمائے ادب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی گراں قدر تحریروں سے میری تخلیقات کا محاکمہ کیا۔ جناب مشتاق احمد الیکٹریکل انجینئر جناب محمد ریاض قریشی، رشید رشی، دخترم نازیہ اور رحیم ملکانی کا احسان مند ہوں جن کے مالی تعاون سے میری کتب زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ اپنے اُن قارئین کا بھی دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں جنہوں میری ہر تصنیف کو شرفِ پذیرائی بخشا اور جناب یونس خان بزدار (کمپوزر) اور جناب علی اعجاز نظامی (ٹائیٹل ڈیزائنر) بھی میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ **میں جناب ظفر یوسفی کاتب لیہ کا ممنون ہوں جنہوں نے کمپوزنگ کے اغلاط کی درستی کی!**

شعیب جاذب

قرآن کیا ہے
قرآن اور حسینؑ
معارفِ حسینؑ
پیغام حسینؑ
کام رق
تفہیم الحسینؑ
آثار وافکار اکادمی پاکستان کراچی سے ایوارڈ یافتہ
صفحات 350
قیمت 250 روپے
مصنف شعیب جاذب
جدید غزلیات اور علامتی ادب کا شہکار
پیاسی چھاگل پیاسے لوگ
صفحات 128
ملنے کا پتہ:۔ ارشاد دانش ناز سینما روڈ لیہ
قیمت 130 روپے

جن کے سلامت پر ہوتے ہیں
خون میں اکثر تر ہوتے ہیں

روشنیوں کے ہر منظر میں
کتنے پس منظر ہوتے ہیں

گل کے ہاتھ سے اڑ جاتی ہے
خوشبو کے بھی پر ہوتے ہیں

شہر انا میں دیکھ کے چلنا
سر والے خود سر ہوتے ہیں

کتنے دیپ ہیں جو بجھ بجھ کر
زیبِ راہ گزر ہوتے ہیں

کتنی بیٹیوں کے ورثے میں
زخموں کے زیور ہوتے ہیں

شعلوں کے آرام کی خاطر
تنکوں کے بستر ہوتے ہیں

جن پہ نہ ہو سوچوں کی بارش
ذہن وہی بنجر ہوتے ہیں

گو ہم ہیں آوارہ سورج
شام کو پھر بھی گھر ہوتے ہیں

جانے کس پاداش میں جاذبؔ
آنسو چشم بدر ہوتے ہیں

اس لیے پیڑ بڑے ہوتے ہیں
اپنے پاؤں پہ کھڑے ہوتے ہیں

وقت کی دودھیا راہوں میں کئی
قرمزی پھول پڑے ہوتے ہیں

ہم ہیں زندانِ وفا کے قیدی
ہم پہ پہرے بھی کڑے ہوتے ہیں

سر بکف ہم نے انہیں کو دیکھا
جو اصولوں پہ اڑے ہوتے ہیں

روح تیری ہے تو ڈوبے گی ضرور
جسم تو کچے گھڑے ہوتے ہیں

آنسوؤں نے ہمیں ڈھانپا ہے تو کیا
نخل پانی میں کھڑے ہوتے ہیں

ہائے وہ لفظ جو حسرت بن کر
قبر کی سِل میں گڑے ہوتے ہیں

شخصیت پر ہے مدارِ انساں
سائے تو قد سے بڑے ہوتے ہیں

وہی معروف ہوئے ہیں جاذبؔ
جن ادیبوں کے دھڑے ہوتے ہیں

اتر کے مجھ پہ یہ احسان دھر گیا دریا
کہ ریت سے مجھے سیراب کر گیا دریا

تمام رات گھروندے گرے، اُٹھیں چیخیں
پھر اس کے بعد نجانے کدھر گیا دریا

سنا ہے لمبی زبانیں نکال کر ٹیلے
یہ کہہ رہے تھے کہاں جا کے مر گیا دریا

وہ جیسے بھانپ گیا میرے ڈوبنے کی لگن
مرے اترنے سے پہلے اتر گیا دریا

ذرا سا اترا تو کاندھے تک آ گیا پانی
جنازہ بن کے مرے دوش پر گیا دریا

ازالہ اور ہو کیا بھوک کی شکایت کا
بھنور کا پیٹ تو ناؤ سے بھر گیا دریا

پھراب کے بچ گئے غرقابیوں کے زہر سے لوگ
سروں سے سانپ کی صورت گزر گیا دریا

ہمارا گھر بھی تو پڑتا تھا اس کے رستے میں
ہمارے ہوتے ہوئے کس کے گھر گیا دریا

یہ میری ٹھٹھری ہوئی لاش کا اثر تو نہیں
مجھے ڈبو کے وہ خود ہی ٹھٹھر گیا دریا

کسی کے پاس امانت نہ چھوڑنا جاذبؔ
جو مانگا سیپ نے موتی مکر گیا دریا

جب دکھاتا ہے کبھی جوشِ جوانی دریا
تند طوفاں میں بدل دیتا ہے پانی دریا

گو امڈ آیا تری آنکھ میں پانی دریا
کون سنتا ہے تری رام کہانی دریا

گوری کرنیں ترے تالاب میں اِتراتی ہیں
جب مناتا ہے کبھی شام سہانی دریا

جس گھروندے کو بھی دیکھا وہ کھنڈر کی صورت
خوں رلاتی ہے ہمیں تیری نشانی دریا

حلقِ گرداب نے بچے بھی نگل ڈالے ہیں
کب ہوئی بند تری لاف بیانی دریا

خستہ دل کوئی بھی ہو اس کو ڈبویا تو نے
اک نہیں کچے گھروندے کی کہانی دریا

تشنگی نے کئی معصوم لبوں کو چھیدا
تیرے ہونٹوں سے چھلکتا رہا پانی دریا

لہریں روتی رہیں ساحل کے گلے مل مل کر
جانے کیا کہہ گیا لہروں کی زبانی دریا

کتنے پانی کے پرندے ہیں تری پلکوں پر
کب ہوئی بانجھ تری تشنہ دہانی دریا

ماہیٔ آب نے چھوڑا نہ کبھی ساتھ ترا
تو سدا کرتا رہا ریشہ دوانی دریا

کتنی غرقابیاں پلکوں پہ امڈ آتی ہیں
جب کوئی چھیڑتا ہے تیری کہانی دریا

تری بھیگی ہوئی پلکوں سے یہ محسوس ہوا
کب ہوئی ختم تری اشک فشانی دریا

کتنے کھلتے ہیں تباہی کے دہانے جاذبؔ
جب بھی کرتا ہے کہیں نقلِ مکانی دریا

حرف ہی حرف ہیں گرداب روانی دریا
لغتِ موج میں رکھتا ہے معانی دریا

شانۂ ابر پہ دیکھی جو لبالب چھاگل
بڑھ گئی اور تری تشنہ دہانی دریا

لوگ انگشت بدنداں ہیں ترے ساحل پر
ترے سر سے نہ پھرا ہو کوئی پانی دریا

موج کے دوش پہ کشتی کا جنازہ تو نہ تھا
جانے کیوں کرتا رہا مرثیہ خوانی دریا

تجھ سے تو بجھ نہ سکی پیاس کسی ذرے کی
عمر بھر تو نے یہاں خاک ہی چھانی دریا

ایک غمزے پہ اجاڑے ہیں گھروندے کتنے
فتنہ انگیز رہی تیری جوانی دریا

مری کشتی کو بھنور نے تو ڈبویا ہی نہیں
کیوں تری آنکھ میں بھر آیا ہے پانی دریا

آج فٹ پاتھ پہ کچھ مچھلیاں لہراتی ہیں
کہیں کرتا نہ ہو پانی کی گرانی دریا

اب تو سیلاب کے لہجے میں صدا دیتا ہے
پہلے ایسا تو نہ تھا دشمنِ جانی دریا

اس کو کیا کون اجڑ جاتا ہے طوفانوں سے
دیکھتا کب ہے کسی آنکھ میں پانی دریا

اپنی موجوں کے تلاطم میں گھرا ہے جاذب
کب کہیں کاٹتا ہے رات سہانی دریا

بیکراں صحرا ستم گر دھوپ ہے
دوپہر ہے میرے سر پر دھوپ ہے

کرب کے سائے ہیں لرزاں خوف سے
اب لہو پینے کی خوگر دھوپ ہے

پھر زمستاں میں ٹھٹھرتے ہیں بدن
ایسی خنکی سے تو بہتر دھوپ ہے

ہے اسے چھتنار برگد کی تلاش
جس تنے کے اپنے اندر دھوپ ہے

چار سو جلتی شعاعوں کی تپش
سامنے صحرا سمندر دھوپ ہے

وہ خنک سائے سے کیا شکوہ کرے
جس مسافر کا مقدر دھوپ ہے

یوں لگا ہے شدتِ احساس میں
چاندنی شب میں سراسر دھوپ ہے

دوسروں کے سر پہ ہے سایہ فگن
جس شجر کے اپنے سر پر دھوپ ہے

لُو ، شعاعوں کی تپش ، حدت ، جلن
آج تو دوزخ کا پیکر دھوپ ہے

برف کے پیکر نہ اب گھر سے نکل
دوپہر ہے دھوپ آخر دھوپ ہے

ایک لمحے کا سکوں جاذبؔ نہیں
گھر کے اندر حبس باہر دھوپ ہے

سر پھرے صحرا میں خود سر دھوپ ہے
نارِ نمرودی سے بڑھ کر دھوپ ہے

آگ کی لپٹیں اُٹھیں دریاؤں سے
اچلے گردابوں میں اکثر دھوپ ہے

وصل سے پہلے ہی جل جاؤ گے تم
خوبرو کرنوں کی محور دھوپ ہے

گھر سے نکلو گے پگھل جاؤ گے تم
برف کے پیکر ہو باہر دھوپ ہے

سایۂ دیوار سے اُٹھنا پڑا
پھر پسِ دیوار کافر دھوپ ہے

تیز کرنوں سے گلے چھلنی ہوئے
اس قدر تو ظلم پرور دھوپ ہے

اک زلیخا ہی نہیں ہے مصر میں
چاہنے والوں کی خوگر دھوپ ہے

اوڑھ لی ہے گرچہ بادل کی قبا
پھر بھی ذروں پر جفاگر دھوپ ہے

لوٹتی ہے بادلوں کی اوٹ میں
کون کہتا ہے کہ بے پر دھوپ ہے

کیسی وادی میں بسیرا کر لیا
رات بھر ہے آگ دن بھر دھوپ ہے

چھین لیتی ہے قبائیں جسم سے
کب سے جاذبؔ ظلم پیکر دھوپ ہے

لاکھ پتھر کا گھروندا ہو کہاں رہ جائے گا
کرچیوں کے ڈھیر پر اس کا نشاں رہ جائے گا

قتل ہو جائے گا سورج ، ذبح ہو جائے گا نور
روشنی کا قافلہ بے سارباں رہ جائے گا

تجھ کو عہد جبر میں بھی کھولنا ہوگی زباں
ورنہ اس دنیا میں تو ہی بے زباں رہ جائے گا

جب بھی ہستی کی طنابیں کھینچ لیں حالات نے
اس زمیں کے سر پہ تنہا آسماں رہ جائے گا

چھوڑ جائیں گے مرے احباب اجڑے شہر میں
کرب کے عالم میں آہوں کا دھواں رہ جائے گا

اپنے ہاتھوں آپ تلواروں کو موت آجائے گی
رہتی دنیا تک لہو کا خانداں رہ جائے گا

ظلمتوں کی گھاٹیوں میں جب بھی اترائے گا چاند
چاندنی کا نام زیبِ داستاں رہ جائے گا

کیا خبر تھی موسم برکھا میں دشتِ آرزو
صحبتِ دریا میں بھی تشنہ دہاں رہ جائے گا

زندگی کے دشت میں جب بھی کبھی آندھی چلی
یا بگولے یا غبارِ کارواں رہ جائے گا

پاس سے گزرا جو رودِ نیل سا کوئی وجود
دیر تک خوشبو کا سیلِ بیکراں رہ جائے گا

خوشبوئیں اکدن گلوں کے ہاتھ سے اُڑ جائیں گی
گلستاں بھی محض رنگوں کا جہاں رہ جائے گا

ہر قلمرو میں قلم کے قافلے مٹ جائیں گے
شاعری یا مسلکِ پیغمبراں رہ جائے گا

ہر کہانی کا بنایا جائے گا عنواں مجھے
ایک میرا نام زیبِ داستاں رہ جائے گا

چہرۂ انسانیت پہ چھائے گی افسردگی
جب لبِ دریا کوئی تشنہ دہاں رہ جائے گا

جب میرے اظہار کے شعلے بجھائے جائیں گے
دودھیا کاغذ پہ لفظوں کا دھواں رہ جائے گا

اور اسلوبِ غزل جاذبؔ فنا ہو جائیں گے
اک مرا لہجہ مرا طرزِ بیاں رہ جائے گا

روح کا رشتہ بدن سے جب جدا ہو جائے گا
سانس کے زندان سے قیدی رہا ہو جائے گا

جب سرنگوں میں جلیں گی جستجو کی مشعلیں
کنزِ مخفی سے زمانہ آشنا ہو جائے گا

کاروانِ وقت ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا کبھی
ریت میں گُل ہر چراغِ نقشِ پا ہو جائے گا

سانپ پھینکے گا جو کوئی سامری میدان میں
پھر عصائے موسوی بھی اژدھا ہو جائے گا

چھا گئیں بادل کی جب برسیں گی تشنہ دشت میں
تشنگی کا پیڑ بھی پل میں ہرا ہو جائے گا

خوشبوؤں کے در پہ سر پٹخیں گی پاگل آندھیاں
شاخ کے ہاتھوں پہ جب روشن دیا ہو جائے گا

وقت مانگے گا اگر عمرِ گریزاں کا حساب
میرا ماضی گنبدِ دل کی صدا ہو جائے گا

موسمِ برسات میں جب گڑگڑائیں بجلیاں
شاخ پر بیٹھا پرندہ خود ہوا ہو جائے گا

زندگی کے راستے میں کرچیاں رہ جائیں گی
آدمی جاذبؔ لہو کا نقشِ پا ہو جائے گا

روح نے جسم کہاں چھوڑ دیا
اک کرائے کا مکاں چھوڑ دیا

جانے کیوں گونجتے سناٹوں نے
اپنا اندازِ بیاں چھوڑ دیا

ہر طرف قبر کا سناٹا ہے
زیست نے لا کے کہاں چھوڑ دیا

خون سے ان کی لویں تیز کرو
جن چراغوں نے دھواں چھوڑ دیا

میں نے پوچھا کہ ثباتِ ہستی
اس نے سگرٹ کا دھواں چھوڑ دیا

جا کے آغوشِ لحد تک جاذبؔ
درد نے رشتۂ جاں چھوڑ دیا

جہاں شکاری پرانی کمان چھوڑ گیا
وہیں پرندہ لہو کے نشان چھوڑ گیا

کہا تھا تو نے جسے دور ہو جا نظروں سے
تری خوشی کے لیے وہ جہان چھوڑ گیا

انا کے شہر میں جس کو سمجھ سکا نہ کوئی
وہ گنگ شہر میں اک ترجمان چھوڑ گیا

اسے سمیٹ لیا تندیٔ بہاراں نے
کوئی جو مہکا ہوا گلستان چھوڑ گیا

اسے خبر ہے تھپیڑوں سے کب رسائی ہے
بحورِ عشق کے جو درمیان چھوڑ گیا

ہر ایک موڑ پہ اس شخص کی تلاش رہی
ہر ایک موڑ پہ جو کاروان چھوڑ گیا

وفا کے پھول کوئی شخص تو خریدے گا
وہ آنسوؤں کی سجیلی دکان چھوڑ گیا

عجیب شخص ہے جو آنسوؤں کے ساحل پر
وفا و مہر کا اک خاندان چھوڑ گیا

عجیب شخص ہے جو بارشوں کی رم جھم میں
سمٹتی ریت پہ کچا مکان چھوڑ گیا

اداس شب میں بجاتا وہ بانسری جاذب
کنوئیں کے ڈول میں جو اپنی جان چھوڑ گیا

عقاب زخمی ہوا تو اڑان چھوڑ گیا
زمیں پہ تازہ لہو کے نشان چھوڑ گیا

یہ کس نے چھین لی رعنائی کہکشاؤں کی
اداس چاند بھی اجلا جہان چھوڑ گیا

نجانے کس لیے چپ مہر غکِ بہاراں
نجانے کس کے لیے گلستان چھوڑ گیا

تمام رات ہواؤں سے گفتگو کرتا
دیے کے منہ میں جو اپنی زبان چھوڑ گیا

وہ ٹمٹماتے ہوئے جگنوؤں کا جلوہ تھا
جو میرے ذہن میں وہم و گمان چھوڑ گیا

وفا کی رہ میں مقاتل کو جس نے اپنایا
لہو میں ڈوبا ہوا خاندان چھوڑ گیا

وہیں پہ تازہ لہو کے نشان پائے گئے
جہاں شکاری پرانی کمان چھوڑ گیا

یہ اور بات کہ جاذبؔ رہا ہے ظلمت میں
وہ جاتے جاتے دمکتا جہان چھوڑ گیا

ڈھونڈھ لاؤ کہ مسیحا ہیں کدھر شیشوں کے
ناخنِ سنگ نے چھیلے ہیں جگر شیشوں کے

ان کے قدموں میں نہ کیوں رنگِ حنائی مہکے
رخت بر دوش جو کرتے ہیں سفر شیشوں کے

آئینہ پوش نہ شب اوڑھ کے نکلیں گھر سے
سنگ زادوں کی نظر میں ہیں گہر شیشوں کے

لالہ زاروں میں نہ مہکی ہو نسیمِ سحری
دیر سے خندہ بہ لب ہیں گُلِ تر شیشوں کے

طائرِ فکر کی خاطر ہیں دمکتی شاخیں
عندلیبوں کی ہیں شاخوں پہ شرر شیشوں کے

شوقِ بے پردگی جب سیم بدن اپنائیں
وہ مکانوں میں سجا لیتے ہیں در شیشوں کے

کہہ دو شبنم سے ذرا روک لے ژالہ باری
گل کدوں نے ہیں سجائے ہوئے گھر شیشوں کے

خشک پلکوں میں پروئے ہیں بریدہ آنسو
کالے نیزوں پہ سجائے گئے سر شیشوں کے

جانے کیوں بڑھنے لگے پائے خطاپوش مرے
منزلِ عشق میں ہیں راہگزر شیشوں کے

کرچیاں میٹھے ثمر میں ہیں تو حیرت کیسی
تو نے آنگن میں اگائے تھے شجر شیشوں کے

ذوقِ ادراک کے قدموں میں ہیں چھالے جاذبؔ
حضرتِ عشق نے کاٹے ہیں سفر شیشوں کے

جس نے آنگن میں اگائے ہیں شجر شیشوں کے
اس نے ہر فصل میں پائے ہیں ثمر شیشوں کے

شب کے کانوں میں کہا کر مکِ بے مایہ نے
جھیل میں اُڑنے لگے نجم و قمر شیشوں کے

کیا عجب سنگ تراشوں کی ہنر کاری ہو
شیش محلوں میں دمکتے ہیں جو در شیشوں کے

مثلِ بسمل تھا کوئی طائرِ آئینہ بدن
دور تک بکھرے ہوئے دیکھے ہیں پر شیشوں کے

کہیں مرجان ہے یاقوت ہے زرقون کہیں
کتنے ہاتھوں میں دمکتے ہیں گہر شیشوں کے

رقص کرتے ہوئے جلووں کے خریدار بہت
شہر عکاظ میں بکتے ہیں بشر شیشوں کے

سنگ باری ہے نہ برسات نہ ژالہ باری
کیسے مسمار ہوئے دودھیا گھر شیشوں کے

خود نہ بن جائیں وہ آئینۂ حیرت اب کے
گیت جو گاتے رہے شام و سحر شیشوں کے

مری منزل میں اتر آئی مسافت کی چبھن
مری سانسوں کے سفر میں ہیں ڈگر شیشوں کے

چشمِ جاذبؔ میں نہ پھر خیرگی بس جائے کہیں
دھوپ میں خوب چمکتے ہیں گہر شیشوں کے

آندھی چلی ہے پھیلتا برگد اکھاڑنے
چھاؤں کا مسکراتا ہوا گھر اجاڑنے

بھونچال سے بدن میں دراڑیں تو پڑ گئیں
گردن کہاں جھکائی ہے اونچے پہاڑ نے

تاریکیوں نے آس کا دامن بڑھا لیا
دامن سے مہتاب لگا گرد جھاڑنے

اب اپنی سلوٹوں میں چھپائیں رخِ طلب
یادوں کے آئینے لگے چہرے بگاڑنے

میدانِ شب میں کیسی شرارت ہے دوستو
آئے ستارے ٹوٹ کے جگنو پچھاڑنے

ساحل ہیں گنگ محوِ تماشا بنے ہوئے
لہریں چلی ہیں پاؤں میں کشتی لتاڑنے

اپنا نحیف جسم بچانا محال ہے
سانسوں کے جنگلوں میں لگے شیر دھاڑنے

اس بار انتظار کی دستک بھلی لگی
اس بار آنچ دی ہے دہکتے کواڑنے

اپنوں کے زہر نے انہیں پاگل بنا دیا
خود اپنی آستین لگے لوگ جھاڑنے

یوں حادثوں نے نوچ لیا ہے بدن مرا
جیسے کوئی شکار لگے شیر پھاڑنے

جاذبؔ یہ کیا سبب ہے کہ ریوڑ نجوم کا
لقمہ بنایا رات کے بھوکے بھگاڑنے

قریہ قریہ ڈھلتی چھاؤں
تھک گئی پیدل چلتی چھاؤں

برگد کی کومل بانہوں میں
پہروں رنگ بدلتی چھاؤں

چپکے سے چونکایا کس نے
اُٹھی آنکھیں ملتی چھاؤں

نت شاخوں کی انگلی پکڑے
کافی دیر ٹہلتی چھاؤں

اوڑھ کے شامِ شفق کا آنچل
منہ پر اُبٹن مَلتی چھاؤں

جب حدت سے پالا پڑتا
دن بھر زہر اگلتی چھاؤں

کب پڑتے پاؤں پر چھینٹے
جب لہروں پر چلتی چھاؤں

راز انوکھے اگل رہی ہے
دیواروں سے ڈھلتی چھاؤں

اپنی انگنائی سے چھپ کر
پچھلے پہر نکلتی چھاؤں

سرخ شعاؤں میں دم گھٹتا
جب بھی سر سے ٹلتی چھاؤں

تپتے صحرا کے سینے پر
مونگ ہزاروں دلتی چھاؤں

اجلی اجلی ڈھلوانوں سے
کتنی دیر پھسلتی چھاؤں

ڈستی خوابیدہ آنکھوں کو
تعبیروں کی جلتی چھاؤں

جاذبؔ دھوپ کی بیساکھی پر
آخر کب تک چلتی چھاؤں

دھوپ میں لت پت گوری چھاؤں
چیخ رہی ہے زخمی چھاؤں

عرق عرق ہیں شرم کے مارے
عریاں جسم ہے نکھری چھاؤں

آئینے کے عکس نگر میں
کس برتے پر رہتی ہے چھاؤں

پیپل کے پتوں میں چھپ کر
سرخ ہوا سے ڈرتی چھاؤں

سورج دیس میں بسنے والو
اپنی دھوپ ہے اپنی چھاؤں

سر سر جب سہلاتی سر کو
ظلم ہزاروں سہتی چھاؤں

کتنی نظروں میں بستی ہے
دھوپ نگر کی رانی چھاؤں

روز جلاتی حدت مجھ کو
مجھ میں روز اترتی چھاؤں

گاؤں والے سوچ رہے ہیں
کون خریدے مہنگی چھاؤں

سورج ہنسی نے دیکھا ہے
جلتے جسم سے لپٹی چھاؤں

میں نے ابرِ کرم سے پوچھا
مجھ پر تیری کتنی چھاؤں

سائباں ہے چھلنی چھلنی
کیسی دھوپ اور کیسی چھاؤں

شور ہے برگد کی شاخوں میں
پتوں میں ہے لپٹی چھاؤں

خیرہ ہے بینائی اپنی
آنکھوں میں ہے تپتی چھاؤں

دھوپ ہے مہنگی بازاروں میں
گاؤں میں ہے سستی چھاؤں

لوک کہانی سننے والو
آج کہاں ہے ٹھنڈی چھاؤں

کالی پلکیں نوحہ زن ہیں
تیروں سے ہے زخمی چھاؤں

دیواروں کے سائے سے بھی
کانا پوسی کرتی چھاؤں

جلتے چھینٹے تالابوں کے
جسم پہ ڈالے پانی چھاؤں

سورج نے کیا راز ہے اگلا
پڑ گئی شرم سے پیلی چھاؤں

ساحل نے الزام تراشا
دریا میں ہے میلی چھاؤں

دن بھر پتوں کے پلڑے میں
تُلتے دیکھی کجلی چھاؤں

کوس رہی ہیں اس کی یادیں
جیسے بے پر اڑتی چھاؤں.

جاذبؔ اپنی زنجیروں میں
ہم کو روز جکڑتی چھاؤں

کتنا خوف ہے شام نگر کا
ہو گئی پاگل ڈھلتی چھاؤں

وہم و گماں کا سایہ سر پر
جیسے نخلستان کی چھاؤں

ہر سو برس رہے ہیں شعلے
کب ہے بستی بستی چھاؤں

راتوں کو خوابوں کی حدت
دن بھر ہم کو ڈستی چھاؤں

جاذبؔ دھوپ سے ڈرنے والی
تالابوں میں بہتی چھاؤں

کبھی ہمراہ جو چلتے ہیں پرائے سائے
راہ میں راہ بدلتے ہیں پرائے سائے

وقت کی دوڑ میں اکثر یہی دیکھا ہم نے
لوگ پاؤں میں کچلتے ہیں پرائے سائے

روشنی میں جو کبھی ساتھ نبھاتے ہی نہیں
تیرگی میں کہاں چلتے ہیں پرائے سائے

چاند کیا سوچ کے اترا تری انگنائی میں
کفِ افسوس ہی ملتے ہیں پرائے سائے

زہر رگ رگ میں سمایا ہے کوئی بات نہیں
آستینوں میں بھی پلتے ہیں پرائے سائے

ان کے گلشن میں پگھلتے ہوئے آنسو توبہ
حدتِ گُل سے پگھلتے ہیں پرائے سائے

آنکھ میں کھولتے چشموں نے یہ اظہار کیا
ایک مدت سے ابلتے ہیں پرائے سائے

دھوپ میں جس نے مرا ساتھ نہ چھوڑا جاذبؔ
صرف اس سائے سے جلتے ہیں پرائے سائے

تیغ کو جو میان دیتے ہیں
ایک دن اپنی جان دیتے ہیں

کتنے شاہین ہیں خلاؤں کے
جو چٹانوں پہ جان دیتے ہیں

یہ جبلت ہے اگلے لوگوں کی
قاتلوں کو امان دیتے ہیں

جو سمجھ میں کبھی نہیں آتی
ہم زباں وہ زبان دیتے ہیں

رات بھر کے تھکے ہوئے راہی
کہکشاؤں پہ دھیان دیتے ہیں

بھوک بڑھتی ہے ساہوکاروں کی
جب بھی گندم کسان دیتے ہیں

حادثوں کے نصاب کیا کہنے
آج تک امتحان دیتے ہیں

ہم نے جن کو دیا ہے درسِ عمل
وہ ہمیں آستان دیتے ہیں

مشکیں بھر بھر کے ابر پاروں کی
بارشیں آسمان دیتے ہیں

فیصلہ کر رہا ہے کچھ منصف
لوگ کچھ بھی بیان دیتے ہیں

ہم بھی جاذبؔ ہیں کتنے بے چارے
چارہ گر ہم کو دان دیتے ہیں

دھوپ سے جب بھی ٹھان لیتے ہیں
برگدی چھاؤں تان لیتے ہیں

رشتہ داری سمیٹنے والے
مرضیِ وقت جان لیتے ہیں

جن کو سورج بہت جلاتا ہے
سائباں تن پہ تان لیتے ہیں

وہ محافظ ہیں آج کشتی کے
جو بھنور کی امان لیتے ہیں

معرکۂ زن ہوئی ہے بادِ صبا
شاخِ گل کی کمان لیتے ہیں

گو شکاری نہیں پرندوں کے
پھر بھی تیرو کمان لیتے ہیں

آندھیاں بھی جہاں ہوں سرگرداں
راہ وہ ساربان لیتے ہیں

حادثوں کی جھلستی حدت میں
صبر کی شال تان لیتے ہیں

گرچہ ہم بھی چراغِ سحری ہیں
بادِ سحری کی مان لیتے ہیں

راہ پُر پیچ ہی سہی جاذبؔ
پھر بھی منزل کو جان لیتے ہیں

دشت میں کارواں کہیں بھی نہیں
اب حُدی خواں کہاں کہیں بھی نہیں

کھیت کے رخ پہ آگئی زردی
ابر سا مہرباں کہیں بھی نہیں

وادیٔ سنگ زار سونی ہے
نقشِ شیشہ گراں کہیں بھی نہیں

صاف چوکھٹ کہیں نہیں ملتی
ہے جبیں آستاں کہیں بھی نہیں

دیپ کب کے بجھے فصیلوں کے
رقصِ دودِ فغاں کہیں بھی نہیں

بیچ ڈالے شجر کسانوں نے
چھاؤں کا اب نشاں کہیں بھی نہیں

جس کو سیلاب نے بچایا ہو
ریت کا وہ مکاں کہیں بھی نہیں

ان کی آنکھوں میں ہیں مرے آنسو
قریۂ کہکشاں کہیں بھی نہیں

خامشی کے سفیر سے پوچھو
کیا ترا ترجماں کہیں بھی نہیں

تیر وہ چھوڑتے ہیں محفل میں
جن لبوں کی کماں کہیں بھی نہیں

جس کے دم سے تھیں رونقیں جاذبؔ
شاعرِ خوش بیاں کہیں بھی نہیں

بادلوں کا نشاں کہیں بھی نہیں
دھوپ کا سائباں کہیں بھی نہیں

کشتیاں مضطرب ہیں لہروں میں
آس کا بادباں کہیں بھی نہیں

خون آلود ناوکِ حیراں
طائر نیم جاں کہیں بھی نہیں

آسماں آشیاں سے کہتا ہے
کوندتی بجلیاں کہیں بھی نہیں

فکر کرنے لگے صنم خانے
آذری فن میں جاں کہیں بھی نہیں

ماس ناپید ہو گیا شاید
چیل کا آشیاں کہیں بھی نہیں

ہر طرف چاندنی کے مرغولے
تیرہ شب کا گماں کہیں بھی نہیں

کیسے روشن کریں فصیلوں کو
آج شعلہ زباں کہیں بھی نہیں

غازۂ رخ اتر گیا جاذبؔ
جھٹپٹے کا سماں کہیں بھی نہیں

مہرِ نو کا نشاں ملے نہ ملے
روشنی کا جہاں ملے نہ ملے

اونگھ آنے لگی ستاروں کو
کاسنی کہکشاں ملے نہ ملے

ہم نے خود کو تلاش کرنا ہے
آگہی ناگہاں ملے نہ ملے

پیڑ کی چھاؤں میں پلٹ آنا
دھوپ کا سائباں ملے نہ ملے

آئیں گے ہم عدم کی بستی میں
کوئی خستہ مکاں ملے نہ ملے

شام کو روشنی کا قتل ہوا
کہیں خوں کا نشاں ملے نہ ملے

وہ پرندے شکار کرتے ہیں
کہیں تیر و کماں ملے نہ ملے

راستے چپ کبھی نہیں رہتے
منزلوں کو زباں ملے نہ ملے

ریت کے گھر کئی بنائے تھے
ان کی اب داستاں ملے نہ ملے

روح ایسے بدن سے چمٹی ہے
پھر کوئی خاکداں ملے نہ ملے

ہم حدی خواں تلاش کرتے ہیں
دشت میں کارواں ملے نہ ملے

دھوپ چھاؤں کے کھیل میں جاذبؔ
مژدۂ جانِ جاں ملے نہ ملے

میرے سر پر کہاں
دھوپ کا سائباں

دشت کے ہاتھ میں
ابر کی دھجیاں

ان کو منزل ملی
جو پسِ کارواں

شہر آلودگی
ہیں ہوائیں کہاں

ان کی دیوار پر
نفرتوں کے نشاں

لوگ ساحل پہ تھے
جل گئیں بیڑیاں

زہر پھیلا گئی
ہیر کی داستاں

ہے سرِ ابر پر
دھوپ کا آسماں

میری تربت پہ ہیں
کس قدر مہرباں

کس کے سر سے چھنی
چادرِ آسماں

مرے قدموں میں ہیں
کتنی پگڈنڈیاں

کتنی جاذب نظر
وادیٔ گل فشاں

اک مرا آشیاں
کوندتی بجلیاں

اُن کے منہ میں نہیں
اک رسیلی زباں

پھر سے پیپل تلے
پیار کی ٹولیاں

کیسے محدود ہو
قلزمِ بے کراں

کتنے سالوں کا ہے
سر پہ سالِ رواں

آج گرنے کو ہے
میرا خستہ مکاں

آدمی جب نہیں
آدمیت کہاں

کاش آنکھوں میں ہو
شرم کی داستاں

زیرِ منقار ہے
عندلیبِ فغاں

کتنے جاذب نظر
میرے دل میں نہاں

دشت میں کارواں تلاش کریں
ان کا نام و نشاں تلاش کریں

چلچلاتی ہوئی شعاؤں میں
دھوپ کا سائباں تلاش کریں

تیر تو چل چکے خلاؤں میں
طائرِ نیم جاں تلاش کریں

آشیانہ مرا سلامت ہے
لوگ اب بجلیاں تلاش کریں

آئینے ہو گئے قدِ آدم
کوئی سنگِ گراں تلاش کریں

ماس ملتا نہیں گرانی میں
چیل کا آشیاں تلاش کریں

وہ زمانوں کی قید ہی میں نہیں
ہم کہاں لازماں تلاش کریں

تیرگی چھا گئی فصیلوں پر
کوئی روشن مکاں تلاش کریں

زرد رو ہو چکی ہے کشتِ طلب
ابر سا مہرباں تلاش کریں

حادثوں میں گھرے ہیں مدت سے
کوئی سکھ کا جہاں تلاش کریں

ہر قدم پر ہیں سنگ دل لمحے
نرم دل اب کہاں تلاش کریں

ان کی آنکھوں میں جھانک کر جاذبؔ
قریۂ کہکشاں تلاش کریں

اس وقت خون گردشِ دوراں کا سرد تھا
بُرّاقِ فکر جب مرا آفاق گرد تھا

خود کانپتا تھا بادِ بہاراں کے نام سے
گلشن کی سبز شاخ پہ جو پھول زرد تھا

تارے تھے خنداں لب مجھے تالاب جان کر
میں بھی تو آسماں کی طرح لاجورد تھا

اس وقت سے ہے مرا تعارف حیات سے
چہرہ شبِ الم کا ابھی گرد گرد تھا

وہ شخص جس نے غم کی اُٹھائی تھیں گٹھڑیاں
اس لاغری میں بھی وہ جواں سال مرد تھا

دیکھا ہے میں نے کرب کی بانو کو مضطرب
شاید میں اپنے دور کا اک یزد جرد تھا

یا چشمِ شب سے چاند ڈھلکنے لگا تھا کل
یا پھر کوئی غزال ہی صحرا نورد تھا

اک میں نہ تھا جہان میں رمِ خوردۂ غزل
جاذب غزالِ اشکِ بھی مژدگاں نورد تھا

کب ہے امکان سفر کا ہو ارادہ کوئی
مری منزل ہے کہیں اور نہ جادہ کوئی

ترے چہرے کی تلاوت ہے عبادت میری
گو سمجھتا ہوں نہیں اس میں افادہ کوئی

اپنے ہی خول سے ہر بار نکلنا چاہوں
لوگ تو اوڑھ کے آتے ہیں لبادہ کوئی

قلزم عشق نے ہر بار ڈبویا مجھ کو
جیسے لہروں کی جبلت میں اعادہ کوئی

یا خدا مجھ کو شرابی کی نہ گالی دینا
عمر بھر دیکھا نہیں ساغر و بادہ کوئی

پھول کو ہاتھ لگاتے ہی لرز اُٹھتا ہوں
خار میں کب ہے چبھن اس سے زیادہ کوئی

خون کے اشک بہاتی ہے شفق کی پلکیں
مہر نے اوڑھا لہو رنگ ، لبادہ کوئی

مرے افکار کی پرکار بنائے کیسے
منفی سوچوں کی طرح زاویہ حادہ کوئی

میں نے جس شخص کو دھڑکن میں بسایا دل میں
اس کی چاہت کا نہ تھا پہلے ارادہ کوئی

جو بھی آتا ہے اسے زخم نیا دیتا ہے
ہم نے جاذبؔ کی طرح دیکھا نہ سادہ کوئی

کاغذ کے پھول عطر سے مہکا رہا ہوں میں
دل تتلیوں کے دیر سے بہلا رہا ہوں میں

تھے کتنے کربناک طمانچے ہواؤں کے
رخسار جلتے دیپ کے سہلا رہا ہوں میں

دانستہ کھا رہا ہوں چمکتا ہوا فریب
جگنو بجھے چراغ پہ چپکا رہا ہوں میں

مہنگی پڑی ہے جھولتی ٹہنی زبان کی
لفظوں کے پھول توڑ کے پچھتا رہا ہوں میں

ہے میرے ہاتھ ناقۂ خورشید کی نکیل
دشتِ افق سے پھر اسے لوٹا رہا ہوں میں

لفظوں کے بانجھ پن سے طبیعت اداس ہے
اپنی غزل سے آپ ہی اکتا رہا ہوں میں

آنکھوں کے بحرِ تند میں گرداب ہیں بہت
سیلِ رواں میں کشتیاں پھیلا رہا ہوں میں

پروان چڑھ نہ جائے شُترِ کینہ دشت میں
یہ بات ساربان کو سمجھا رہا ہوں میں

جاذبؔ یہ سچ ہے ان کے تشخص کو مان کر
در اصل اپنے آپ کو منوا رہا ہوں میں

ریاضِ کرب میں جانے لگا ہوں
بیاضِ زخم مہکانے لگا ہوں

سحر کے بعد پھر تاریکیاں ہیں
یہی تو بات منوانے لگا ہوں

لبِ سیلاب ہوں کچا گھروندا
خود اپنے آپ گھبرانے لگا ہوں

تعاقب میں کوئی فرعون آئے
میں بحرِ نیل میں جانے لگا ہوں

سرِ ساحل بہت ہی تشنگی ہے
سمندر کو یہ سمجھانے لگا ہوں

غموں کی اوس نے ٹھٹھرا دیا ہے
ہری شاخوں پہ مرجھانے لگا ہوں

نقوشِ پا کہیں تو چھوڑ جاؤں
نئے صحراؤں میں جانے لگا ہوں

ملے جو مکتبِ کُن کے سخن سے
وہی اسباق دہرانے لگا ہوں

میں ہوں سرمست فاقہ مستیوں میں
ترانے بھوک کے گانے لگا ہوں

سمندر پار بھی دیکھوں گا تجھ کو
نئی بینائیاں پانے لگا ہوں

میں ہوں بیزار اپنی زندگی سے
میں پھر سگرٹ کو سلگانے لگا ہوں

ترانہ چھڑ گیا حق بات کا پھر
نئی سولی پہ پھر جانے لگا ہوں

جلانے جا رہا ہوں اپنی کشتی
میں پھر تاریخ دہرانے لگا ہوں

میں سورج کا تمنائی ہوں جاذبؔ
سحر کی راگنی گانے لگا ہوں

ہو نظر بندی جہاں زندان میں
کون ملتا ہے وہاں زندان میں

کب اجالے یاس کی آغوش میں
ظلمتیں ہونگی جواں زندان میں

خون روتی ہے یہاں انسانیت
کوئی جھانکے تو یہاں زندان میں

اب تو گزرے گی قفس میں زندگی
بن چکا ہے آشیاں زندان میں

حالِ دل اپنا سنائیں کس طرح
کٹ چکی اپنی زباں زندان میں

زندگی ہے جلتے سگرٹ کی طرح
سانس ہے اڑتا دھواں زندان میں

قید تو بھی کاٹتا میری طرح
خالقِ کون و مکاں زندان میں

درس ملتا ہے نصابِ جرم کا
مجرموں کے ترجماں زنداں میں

مری پلکوں نے چنی ہیں دوستو
آدمی کی دھجیاں زنداں میں

آنکھ بھر آئی ہے جاذبؔ جب سنی
بے خطا کی داستاں زنداں میں

(ڈیرہ غازیخان ڈسٹرکٹ جیل میں نظر بندی کے دوران)

جانے کیا بیتی مرے اعصاب پر، اوسان پر
جب پڑی میری نظر خوں تھوکتے انسان پر

دھوپ میں زخمی پرندہ آ کے سستایا نہ ہو
کتنے پر بکھرے پڑے ہیں گھر کے روشندان پر

ایک جگنو گھِر گیا ہے ظلمتوں کی بھیڑ میں
کس قدر یہ ظلم ہے اک رات کے مہمان پر

روح کیسے عمر بھر کی قید سے آزاد ہو
اب بھی سانسوں کی سلاخیں ہیں درِ زنداں پر

کوہ کی چوٹی پہ یوں سجتا ہے ٹکڑا ابر کا
جس طرح محمل دھرا ہو اونٹ کے کوہان پر

ہنستے ہنستے ہر کھلنڈری موج ڈہری ہو گئی
جانے کیا طاری ہوا دیوانہ پن طوفان پر

قوس کی صورت کمر اس کی خمیدہ ہو گئی
تجربوں کا بوجھ جب لادا گیا انسان پر

مستند ہے مری پلکوں کے ورق کی ہر غزل
آنسوؤں کے دستخط موجود ہیں دیوان پر

لے اڑا اس کو لپک کر پھڑ پھڑاتا مہریوں
اک کرن سستا رہی تھی آج روشندان پر

میں دکھوں کے کربلا میں جی رہا ہوں اس طرح
آندھیوں میں دیپ جیسے کھیلتا ہے جان پر

جانے کس جھونکے نے آکر چھین لیں رعنائیاں
سج رہے تھے زخم جاذبؔ روح کے گلدان پر

یوں بھی آنسوں مری پلکوں سے لگا تار گرے
جس طرح ٹوٹ کے گردن سے کوئی ہار گرے

ڈور کاٹوں جو شعاؤں کی تو سورج کی پتنگ
گرتی پڑتی مرے پاؤں میں کئی بار گرے

گھنٹیاں یاد کی یوں کان میں رس گھول گئیں
جیسے خوابوں میں کوئی کانچ کی دیوار گرے

آج اس زور سے ظلمات کا بھونچال آیا
صبح سے پہلے نئی صبح کے آثار گرے

کیا ہوا آپ کے چہرے پہ شفق پھولی ہے
پھول اگتے ہیں مرے خوں کی جہاں دھار گرے

اور کیا اپنی نگاہوں سے گرائے گا کوئی
ہم تو خود اپنی نگاہوں میں کئی بار گرے

یوں تمدن نے نئے موڑ پہ ٹھوکر کھائی
عالمِ ضعف میں جیسے کوئی بیمار گرے

کیا کرے گا کوئی فریاد مرے مرنے پر
شور اُٹھتا نہیں جب ریت کی دیوار گرے

ایسی قوت بھی تو ہو کوئی پسِ پردۂ جرم
خود بخود ٹوٹ کے زنجیرِ گراں بار گرے

ایسے قدموں کی مجھے کھوج رہی ہے جاذبؔ
جن کی تعظیم کو مہتاب کی دستار گرے

میرا آنسو جھوٹی آشاؤں کی پیداوار ہے
جگمگاتی ریت دریاؤں کی پیداوار ہے

جس کی چھاؤں میں ملا ہر اک مسافر کو سکوں
وہ دعاؤں کا شجر ماؤں کی پیداوار ہے

چاندنی جیسے ترے چہرے کی ہے گردِ ملال
کہکشاں شاید ترے پاؤں کی پیداوار ہے

کیوں نہ برسے پانیوں پہ اس کو صحراؤں سے کیا
ابر پارہ بھی تو دریاؤں کی پیداوار ہے

سوچیے تو ایک ہی سورج کے دو کردار ہیں
چلچلاتی دھوپ بھی چھاؤں کی پیداوار ہے

خال وخد اس کے ترے چہرے سے ملتے ہیں بہت
صبح کا سورج ترے گاؤں کی پیداوار ہے

ذہن کی اجلی شعاعوں نے یہ ثابت کر دیا
بے وقوفی صرف داناؤں کی پیداوار ہے

ہم نے جاذبؔ اپنے گھر میں رو کے ظاہر کر دیا
آنسوؤں کی بیل کٹیاؤں کی پیداوار ہے

میں اپنی ذات میں برگد ہوں میرے سائے بہت
خود اپنی پھیلتی شاخوں سے خوف آئے بہت

گلاب رت کو پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا
یہ اور بات کہ خوشبو مجھے بلائے بہت

جھلستی دھوپ کے صحرا میں ایسا پیڑ ہوں میں
خود اپنی چھاؤں کی حدت جسے جلائے بہت

وہ اپنے دودھیا لہجے میں بات کرتا ہے
دمکتا چاند تو لہروں میں گنگنائے بہت

یہ واقعہ ہے کہ جس نے ہزاروں زخم دیے
کبھی جو یاد کروں اس پہ پیار آئے بہت

قلم کے شہر میں خود اس کو روشنی نہ ملی
قلم کے شہر میں جس نے دیے جلائے بہت

وہ اپنی چاندنی میں خوشگوار رہتا ہے
بلا کی تیرگی جاذبؔ پہ مسکرائے بہت

ماں کے زخمی لال چپ رہنے لگے
لوگ حسبِ حال رہنے لگے

جانے کیوں سہمے ہوئے ہیں لوگ سب
گونجتے پنڈال چپ رہنے لگے

بحر میں آئی ہیں یوں طغیانیاں
مچھلیوں کے جال چپ رہنے لگے

سوہنیوں میں آگیا ہرجائی پن
آج ماہیوال چپ رہنے لگے

جب سے مضرابوں کو اونگھ آنے لگی
مطربُ سُر تال چپ رہنے لگے

جبر کے چابک کی اک آواز سے
دھاڑتے چوپال چپ رہنے لگے

بے رخی سے دھند کے بادل اُٹھے
صاف گو تمثال چپ رہنے لگے

مرقدوں پر دیکھ کر ویرانیاں
وقت کے قوال چپ رہنے لگے

مضطرب گاؤں کے گاؤں دیکھ کر
شہر کے خوش حال چپ رہنے لگے

ختم لاوا ہو گیا جذبات کا
وقت کے بھونچال چپ رہنے لگے

چال والے چال ایسی چل گئے
سب کے سب بے چال چپ رہنے لگے

کل تلک جاذبؔ چہکتے تھے بہت
جب ہوئے کنگال چپ رہنے لگے

ایسے گھرا ہوا ہوں سلگتی دوپہر میں
جیسے شجر ہو دشت کا شعلوں کے قہر میں

دونوں جہاں آنکھ کی پتلی میں آ گئے
جیسے کوئی اُنڈیل دے دریا کو نہر میں

سورج غموں کا آ کے مرے سر پہ ڈٹ گیا
سانسیں ہیں سوگوار غموں کی دوپہر میں

ساحل کی گھورتی ہوئی نظروں کو کیا خبر
کرب و الم کی کروٹیں ہیں لہر لہر میں

یاد آ گئیں وہ سیمگوں انگڑائیاں تری
رقصاں ہوا جو جھوم کے مہتاب نہر میں

اب تو قدم قدم پہ دھندلکوں کا راج ہے
سورج بھی ماند ہے کسی کہرے کے قہر میں

انسانیت کی جستجو کرتا رہا جہاں
ڈھونڈے سے کب ملا کوئی انسان دہر میں

شاید دل و دماغ کو مل جائے کچھ سکوں
آ تو گیا ہوں خیر سے لفظوں کے شہر میں

لاکھوں جتن کیے کوئی انساں نہ مل سکا
انسانیت بھٹکتی رہی شہر شہر میں

ہم بڑھ رہے ہیں آج بھی مریخ کی طرف
کوئی بھی مشتری نہ ملا ہم کو دہر میں

ہنس کر جو آج حضرتِ جاذبؔ نے پی لیا
شاید مٹھاس تھا لبِ گیتی کے زہر میں

کرب زادوں کی صدا بولے ہے
اب تو سجدے میں خدا بولے ہے

اپنی گردن میں ہے دم خم کتنا
سر کٹا کر یہ انا بولے ہے

گفتگو میں ہے مہک پھولوں کی
کس سلیقے سے صبا بولے ہے

روشنی کا بھرم نہ کھل جائے
مہر کی لغزشِ پا بولے ہے

چھوڑ دیتا ہے دھواں نفرت کا
دیپ سے جب بھی ہوا بولے ہے

آئینہ خانے کے لب پر نغمے
گنگ پتھر کا خدا بولے ہے

لوگ کرتے ہیں بتوں کو سجدہ
جانے ابلیس بھی کیا بولے ہے

قریۂ خاک میں چپ ہے جاذبؔ
کب یہ نقشِ کفِ پا بولے ہے

غموں سے اپنا ہم آغوش رہنا
ستم سہنا . مگر خاموش رہنا

گجر کے ہونٹ پر چھالے پڑے ہیں
سزا کم ہے سحر بردوش رہنا

ہیں دستِ مہرِ نو میں تازیانے
چمن زادو نہ شبنم نوش رہنا

خزاؤں کو کہاں اچھا لگے گا
یہ خار و گل کا ہم آغوش رہنا

مری کشتی کے چہرے پر متانت
مگر سیلاب کا پُر جوش رہنا

فراتِ چشم پر تیروں کی بارش
لبِ تشنہ ذرا خاموش رہنا

نہ آ جانا کہیں اپنی نظر میں
خود اپنے آپ سے رو پوش رہنا

سمندر پیاس سے اک دن جلے گا
مرے بادل گھٹا بردوش رہنا

لبِ دریا ہے اب اپنا گھروندا
مرے بچے ذرا باہوش رہنا

اگر خواہش ہے اڑتی تتلیوں کی
گلابوں کی طرح خوش پوش رہنا

زمانے میں جہاں مرگِ قلم ہو
قیامت ہے وہاں خاموش رہنا

یقیناً ہے تباہی کی علامت
کسی سیلاب کا پر جوش رہنا

زباں کرنوں کی اب کھلنے لگی ہے
مرے جاذبؔ ہمہ تن گوش رہنا

یہ مخمصہ بھی عجب ہے نہ سوزِ دل نہ سکوں
نہ زندگی میں کوئی کربِ مستقل نہ سکوں

تمہاری یاد تو ناخن دراز ہے ، بیشک
ستم تو یہ ہے کہ زخمِ فراق چھل نہ سکوں

یہ اور بات ہے اک حرفِ گل نما ہوں میں
مگر زبان کی ٹہنی پہ آ کے کھل نہ سکوں

ازل سے سوچ رہا ہوں اک ایسا منصوبہ
کہ اپنی ذات کی خلوت میں ہو مخل نہ سکوں

مری تلاش کے صحراؤں میں بھٹک تو سہی
کوئی خدا تو نہیں ہوں کہ تجھ کو مل نہ سکوں

وہ دن نہ آئے کہ جب ترا قُرب ڈس لے مجھے
وہ شب نہ آئے کہ خوابوں میں تجھ کو مل نہ سکوں

کبھی تو دستِ زلیخا کی مثل بڑھ تو سہی
میں کوئی دامنِ یوسف نہیں کہ سل نہ سکوں

مرا وجود ہے جاذبؔ مزار ہستی کا
یہاں نہ دکھ نہ سکھ ہے نشاطِ دل نہ سکوں

دھوپ میں پیدل آتی ہے
جذبوں کو بھڑکاتی ہے

جانے بارش کب اترے
ہاتھوں میں برساتی ہے

رستوں میں ہیں سانپ بہت
پگڈنڈی لہراتی ہے

سرخ گلابی زخموں کو
خوشبو خود سہلاتی ہے

گھر کو کیسے لوٹیں گے
رات نکھرتی جاتی ہے

گلشن سے مفرور ہوئی
خوشبو بھی جذباتی ہے

آندھی جانے والوں کے
نقش مسلتی جاتی ہے

فطرت اپنے ہونٹوں پر
صدیوں کو دہراتی ہے

سیپیاں چننے ساحل پر
لہر اچھل کر آتی ہے

میرے نام سے تنہائی
جانے کیوں گھبراتی ہے

میلے چاند کو کرنوں سے
چاندنی خود نہلاتی ہے

آج انیلی چوٹی پر
کرن کرن اٹلاتی ہے

برف نگر کے راہی کو
دھوپ بہت پگھلاتی ہے

گلشن گلشن بادِ صبا
سانسوں کو مہکاتی ہے

آج پیاسے پربت پر
اک بدلی منڈلاتی ہے

طاقِ دل پر آتے ہی
دستک نغمے گاتی ہے

اجلی رت بینائی پر
ظلم انوکھے ڈھاتی ہے

جاذبؔ زخم ہرے رکھنا
سوچ تری جذباتی ہے

1

گُل کے بدن سے جامۂ خوشبو اتار بھی
اب تو بدل چکا ہے نظامِ بہار بھی

آندھی وہی چراغ بجھانے پہ ہے بضد
دیتا ہے روشنی جو سرِ رہگزار بھی

کیوں ڈوبنے لگے ہو اجالوں کی فکر میں
لو رہے ہیں چاند کے تاریک غار بھی

شاہِ فلک تو کُہر کے پردے میں چھپ گیا
جلووں کا کر رہا ہے کوئی انتظار بھی

کب تک پھرو گے روح کی گٹھڑی اُٹھائے تم
اک روز ٹوٹنا ہے بدن کا حصار بھی

اس گل بدن کی ذات کوئی گُل کھلائے گی
دشمن گلوں کی ہوگئی بادِ بہار بھی

پانی کی بوند بوند کو میں تو ترس گیا
دجلے کو کیا پڑی ہے رہے شرمسار بھی

آنکھوں سے پھوٹتے ہوئے جھرنے عجیب ہیں
جیسے کسی پہاڑ میں ہو آبشار بھی

کوئی بھی رنگ ہو نہ سکا جاذبِ نظر
چہروں کے پڑھ چکا ہوں کئی اشتہار بھی

دکھ جو کربل جیسا ہے
وقت بھی مقتل جیسا ہے

آج کہیں انسان نہیں
شہر بھی جنگل جیسا ہے

میں بھی تشنہ صحرا ہوں
وہ بھی بادل جیسا ہے

جلتا بجھتا ہے شب بھر
جگنو مشعل جیسا ہے

نگل رہا ہے لوگوں کو
وقت بھی دلدل جیسا ہے

ماضی نے بھی زخم دیے
کل بھی بےکل جیسا ہے

سانپ گلابی ہونٹوں پر
رنگ بھی صندل جیسا ہے

ریگِ رواں پہ لیٹو تو
بستر مخمل جیسا ہے

جسمِ شب پر چاندی کا
کرتہ ململ جیسا ہے

ناری دھوپ کا عریاں سر
ابر بھی آنچل جیسا ہے

اب تو جاذبؔ کھیتوں کا
رنگ بھی ہر دل جیسا ہے

پاؤں میں سانپ کچلنے والے
آستینیں ہیں بدلنے والے

پہلے منزل کا تعین تو کریں
جو مرے ساتھ ہیں چلنے والے

شبنمی اشک کی صورت نہ گریں
مسندِ گل پہ مچلنے والے

آؤ دریا کے کنارے پہ چلیں
سیپ ہیں راز اگلنے والے

گیسوئے بنتِ سحر میں الجھے
بسترِ شب کو بدلنے والے

خوشبوئیں خود ہی بلا لیتی ہیں
ہم نہیں خواب میں چلنے والے

برگدوں میں ہے بلا کی حدت
لوگ چھاؤں میں ہیں جلنے والے

دھڑکنیں تیز ہوئی جاتی ہیں
شام کے سائے ہیں ڈھلنے والے

پھنس نہ جائیں وہ کہیں دلدل میں
کوہساروں سے پھسلنے والے

بجلیوں میں ہے چکا چوند بہت
ابر سر سے نہیں ٹلنے والے

ہر طرف آگ تعصب کی جلی
اب ہرے شہر ہیں جلنے والے

خوشبوؤں سے نہ چمن جل جائیں
پھول ہیں پھولنے پھلنے والے

جانے کس سمت روانہ ہوں گے
شب کی دلدل سے نکلنے والے

سیمگوں کیچ بہت ہے جاذبؔ
لوگ اب کے ہیں پھسلنے والے

سفر صحراؤں میں کٹتا رہا ہے
مسافر گرد میں اٹتا رہا ہے

یہی را مشگری ہے ماہِ تاباں
کبھی بڑھتا کبھی گھٹتا رہا ہے

یہ کتنا ظلم ہے منصف کے ہاتھوں
گلا انصاف کا کٹتا رہا ہے

میں قدموں کی طرح بڑھتا رہا ہوں
وہ مثلِ نقشِ پا ہٹتا رہا ہے

سلگتی چاندنی کا ابرِ نیساں
بہت ہی دیر تک چھٹتا رہا ہے

رہِ تسلیم میں جو بھی جھکا سر
ستم کی تیغ سے کٹتا رہا ہے

چمن زادوں کا پالک شاخِ گُل پر
مثالِ مشک بو بٹتا رہا ہے

میں بڑھتا ہی رہا ہوں مد کی صورت
جزر کی مثل وہ ہٹتا رہا ہے

چھری اس نے چھپائی تھی بغل میں
وفا کے جو سبق رٹتا رہا ہوں

خود اپنی ذات کے ملبے میں جاذبؔ
بہت ہی دیر تک اٹتا رہا ہے

چمن کا رازِ مہک جب صباء نے بھانپ لیا
برہنہ باس کو پھولوں نے مل کے ڈھانپ لیا

یہ کہہ کے ہوگئے رخصت نجومِ آخرِ شب
سحر کے خوف سے جو کانپنا تھا کانپ لیا

ہوا جو شوق کبھی خود ہی ڈنک کھانے کا
تو آستین سے اس نے نکال سانپ لیا

کہیں نہ سایۂ برگد نہ سائباں کوئی
سفر کی دھوپ میں جی بھر کے ہم نے ہانپ لیا

دھوئیں کے اڑتے تکدر میں گھر گئے جاذبؔ
کسی دیئے کو جو فانوس بن کے ڈھانپ لیا

ملگجی تصویر تابندہ ہوئی
خواب کی تعبیر شرمندہ ہوئی

آڑے آئے گی انا کیشی نہ پھر
گر ہماری بات آئندہ ہوئی

مٹ گئی تھی روشنی کی جو کرن
آنکھ کے مدفن میں پھر زندہ ہوئی

شعر گوئی بھی جگر خوارہ سمجھ
یہ جبلت صورت ہندہ ہوئی

بعد مردن یار جاذبؔ آئیں گے
زندگی جو مر کے پائندہ ہوئی

اک دھوپ جو چھاؤں کی سہیلی بھی نہیں ہے
وہ ابر کی آغوش میں کھیلی بھی نہیں ہے

دیکھو تو معمہ ہے جو حل ہو نہیں سکتا
سوچو تو مری ذات پہیلی بھی نہیں ہے

اب خانۂ دل میں تجھے جھانکے کوئی کیسے
دروازہ نہیں کوئی حویلی بھی نہیں ہے

کرنیں تو نری تیری لکیروں کی طرح ہیں
مہتاب کوئی تیری ہتھیلی بھی نہیں ہے

گرداب کے پنگھٹ پہ نہ لے جا وہی کشتی
ساحل کی جو آغوش میں کھیلی بھی نہیں ہے

مہتاب کو سینے پہ لٹاتی ہے یہ شب بھر
گو تیرا شبِ شب کی سہیلی بھی نہیں ہے

پیڑوں نے کچھ سوچا ہوتا
آندھی سے سمجھوتا ہوتا

اس آنگن میں سجتیں کرنیں
چاند فلک سے اترا ہوتا

جلتے دیپ کا دم گھٹ جاتا
جب بھی سرخ سویرا ہوتا

سانسوں میں اک یاد مہکتی
بادل عطر کا برسا ہوتا

سازش کر لیتا لہروں سے
سامنے جب بھی دریا ہوتا

سنگ نگر میں چلنے والے
آگے پیچھے دیکھا ہوتا

ربط بڑھاتے دشمنِ جاں سے
ممکن ہے یہ اچھا ہوتا

پانی پیتا دریاؤں سے
جب بھی بادل پیاسا ہوتا

تیری سوچوں کو چمکانے
چاند فلک سے اترا ہوتا

ہو جاتا جنگل میں منگل
پانی دشت میں برسا ہوتا

کیوں چلتا بے سمت سفر کو
جس نے رستہ دیکھا ہوتا

سرمئی دہلیز پر اک سرخ رہزن دیکھ کر
شام سہمی اپنے ہی آنگن میں کندن دیکھ کر

اور کتنے آشیاں ہیں قریۂ اشجار میں
بجلیاں پر تولتی ہیں میرا گلشن دیکھ کر

زندگی میری نظر میں ہیچ ہو کر رہ گئی
پھول مرجھائے ہوئے بالائے مدفن دیکھ کر

کرب کی دہلیز پر ہے کہکشاں اتری ہوئی
تیرگی سہمی رہی آنکھوں کو روشن دیکھ کر

حدتوں میں زندگی کیسے بسر کرتا ہوں میں
دھوپ مسکانے لگی ہے میرا مسکن دیکھ کر

لوگ جو ٹھنڈے لحافوں میں پڑے تھے رات سے
گھر سے باہر آگئے وہ روزِ روشن دیکھ کر

کھل گئی ہے آنکھ جاذبؔ طائرِ افلاک کی
روشنی اِترا رہی تھی میرا آنگن دیکھ کر

وادئ عصر میں سورج نے یہ منظر دیکھا
مرا سایہ بھی مرے قد کے برابر دیکھا

وہی دریا مری کشتی سے بغل گیر ہوا
جس کی بغلوں میں نئی لہر کا خنجر دیکھا

دستِ خورشید میں جلووں کی لکیریں نہ ملیں
شب کے ماتھے پہ اجالوں کا مقدر دیکھا

صحن میں کوئی شجر جب بھی ثمر بار ہوا
پسِ دیوار ہر اک ہاتھ میں پتھر دیکھا

ہنستی عذرائیں تو پینگیں ہی بڑھانے آتیں
بوڑھے برگد نے جوانی میں یہ اکثر دیکھا

صحن کتنے ہیں جو گہوارہ ہیں تاریکی کا
اڑتی کرنوں نے تماشہ یہی گھر گھر دیکھا

جانے کیا بات تھی احباب تھے سب سنگ بدست
وادیٔ زخم سے اک روز جو مُڑ کر دیکھا

جب بھی جاذبؔ کہیں چھلکیں جو نشیلی آنکھیں
دستِ گلگوں میں کھنکتا ہوا ساغر دیکھا

جگرِ لخت لخت

میرا دریا میں اترنے کا ارادہ ہی نہیں
سلوٹیں پھر کس لیے دریا کی پیشانی پہ ہیں

کیا جو بھوک نے جاذبؔ درازِ دستِ سوال
تو قہقہوں میں صدائے فقیر ڈوب گئی

ترے لیے تو قضا بھی ہے ایک تاج محل
مرے لیے تو مری زندگی بھی سولی ہے

پیٹ کی خاطر جتن کرتا نہیں کیا کیا کوئی
دیکھ بھوکی شام کو سورج نگلنا ہی پڑا

قریۂ کرب میں رہتے رہتے
زندہ رہنے کی دعا سے ڈرتا

کرب کی پتیاں چنتے چنتے
سرخ پھولوں کی قبا سے ڈرتا

اپنی پیشانی کی تختی سے مٹا دوں گا وہ حرف
کاتبِ تقدیر نے جو کج ادائی سے لکھا

جنگل جنگل مست ہوائیں
شہروں میں دربست ہوائیں

میرے ماتھے پر غریبی کا نشاں دیکھے کوئی
تیر کا جیسے نشاں مشکیزۂ عباس پر

یہ تو گرداب ہے اصغر کا یہ جھولا تو نہیں
لہر کیوں سینے پہ کرتے ہوئے ماتم اُٹھی

اب اپنے احتجاج کے شعلوں میں آپ جل
کس نے تجھے کہا تھا کہ جلتی پہ تیل ڈال

پیار سے جس کو مشیت لو ریاں دیتی رہی
مادرِ فطرت کا میں وہ لاڈلا فرزند ہوں

انسان کو فرشتہ بنانے کا فائدہ
تم اعترافِ عظمتِ آدم کیا کرو

سَحر کی دودھیا منزل کے ہم مسافر ہیں
ہمارے ساتھ کہاں تک چلے گی تاریکی

حکمِ سجدہ نے یہ ڈالی ہیں دراڑیں، ورنہ
لبِ ابلیس پہ آدم کا قصیدہ ہو تا

جاذبؔ اک عمر سے ہے مری سانس گھات میں
میں جی رہا ہوں دشمنِ جانی کے با وجود

حادثوں کا وار بھی کتنا اذیت ناک تھا
میری گردن پر درانتی کی طرح چلتا رہا

جاذب تجھے کس طرح لگی جونک غموں کی
اے دوست بدن تیرا تو پتھر کی طرح تھا

کچھ ایسے زندگی گزری ہے اپنی
کہ جیسے نیند میں چلنے لگے ہیں

پیٹ کی خاطر جتن کرتا نہیں کیا کیا کوئی
دیکھ بھو کی شام کو سورج نگلنا ہی پڑا

اپنے جوڑے میں ستاروں کا جڑاؤ کر کے
آج شرمانے لگی جھیل بھی دلہن کی طرح

قہقہہ رَس بھرا سہی لیکن
نخلِ ہستی کا اس کو پھَل نہ بنا

(عکس حیات

اصل نام ملازم حسین

ادبی نام شعیب جاذب

تاریخ پیدائش 1 مئی 1940ء لیہ

مطبوعہ کُتب

1۔ تفہیم الحسین (ایوارڈ یافتہ) منقبت

2۔ خطیبِ نوک سناں منقبت

3۔ پیاسی چھاگل پیاسے لوگ غزلیات

4۔ دھوپ کا سائباں //

غیر مطبوعہ کُتب

1۔ ارمغان حرم 2۔ سراج نہج البلاغہ۔

3۔ گہوارہ آغوش رسالت 4۔ تپتا مہر سلگتی چھاؤں

5۔ دشتِ احساس 6۔ بستی بستی دھوپ

7۔ نافۂ غزل 8۔ ستاروں سے آگے

9۔ سُلگتے حروف 10۔ تو جو نہیں ہے

11۔ پہلی پوڑی 12۔ تفہیم الحسین II

13۔ تہذیب الحسین 14۔ بکائے کرب وبلا

رابطہ شعیب جاذب ناز سینما روڈ لیہ

موبائل 0300-7512994

زبان زہر کی تلخی سے کھول بھی نہ سکوں
لبوں پہ سانپ بٹھا دو کہ بول بھی نہ سکوں

شعیب جاذب

صدائے قادری پرنٹرز چوبارہ روڈ لیہ۔ 0606-413248: